www.shibliinternational.com

ستمبر 2018

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

15/- روپے

ستمبر ۲۰۱۸ء

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد:۱۔شمارہ:۸

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابو ہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامیؔ

پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ

محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو

ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین

ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان

ابو ہریرہ (اینکر: نیوز 18) محسن خان

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

قیمت فی شمارہ: 15

سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	5
۲	نعت شریف	اقبال سہیل	6
۳	غزل	پروفیسر مظفر علی شہ میری	7
۴	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۴)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	7
۵	کتابوں کا ذوق	مولانا انصار احمد معروفی	11
۶	غزل	صوفی سید عبدالرحیم کامل اجمیری	12
۷	غزل	علینا عترت	13
۸	ناموران ہند کو نذیر بنارسی کا خراج عقیدت	ڈاکٹر ناظر حسین خان	14
۹	غزل	ڈاکٹر معین افروز	20
۱۰	اقبال اور دبستان شبلی ایک مطالعہ	حکیم وسیم احمد اعظمی	21
۱۱	حیدرآباد کی چند مشہور خواتین شعراء	اسریٰ تسنیم	31
۱۲	اقبال فہمی	احمد نور عینی	33
۱۳	غزل	محمد مظہر محی الدین مظہر	36
۱۴	مسجد نبوی کی توسیع اور مختلف ادوار میں اس کی تاریخ	رفیعہ تبسم	37
۱۵	حضرت سید شاہ شجاع الدین علی حسن حسینی قادری	حکیم سید شاہ خیر الدین قادری صوفی	39
۱۶	ایشین گیمس 2018	ابو ہریرہ ایوبی	40
۱۷	کتاب 'مضراب نقد'	مبصر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	41

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

الحاج نواب **حیدر علی**، کنگ کوٹھی حیدرآباد.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد..... **ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی۔

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ جناب **محمد ابوطاہر** انجینئر، ٹولی چوکی حیدرآباد

اداریہ

صدائے شبلی کے سات شمارے الحمدللہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ اللہ وحدہ لاشریک لہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان، قارئین کی قدر وعنایت اور محبانوں کی خاص دعاؤں کی برکت ہے کہ ہماری تحریک روز بروز ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ادارہ بھی ہر زاویے سے کوشش کررہا ہے کہ اس رسالے کو کس قدر مفید بنایا جائے۔ امید ہے کہ اہل علم ودانش ہمارے اس مشن میں مشورے سے نوازیں گے۔ جزاک اللہ خیر۔

ماہ گزشتہ میں ہمارے ملک کی ایک اہم ریاست کیرلا سیلاب سے بری طرح متاثر ہوگئی۔ آن کی آن میں انسانی ضرورتوں کے سارے سامان دسترس سے باہر ہوگئے، جانی مالی نقصانات ناگفتہ بہ حالات کی کہانی بیان کررہے ہیں۔ سوشل میڈیا، الکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا نے جو تصاویر دکھائی ہیں، اسے دیکھ کر دل کانپ اٹھتا ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ خیر قدرت کے سامنے ساری چیزیں بے بس ہوجاتی ہیں اور قدرت بھی کسی وقت امتحان لے سکتی ہے۔ ہمارے جوانوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر کئی انسانوں کی زندگیاں بچائیں، ان نوجوانوں کی خدمت میں ادارہ سلام پیش کرتا ہے، ان مصائب وآلام کی گھڑیوں میں انسانی خدمت کا وہ نظارہ سامنے آیا کہ جس کی وجہ سے یہ کہنا بجا ہے کہ ابھی بھی اس گئے گزرے زمانے میں انسانیت بلا لحاظ مذہب وملت کے زندہ ہے۔ منادر ومساجد اور گرجا گھروں کے دروازوں کو ایک دوسرے کے لیے کھول دیا گیا۔ حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں کے درمند وزیروں اور ملازموں نے ممکنہ حد تک مدد فرمائی۔ ملک میں مختلف سوسائٹیوں اور تنظیموں نے دامے درمے سخنے کیرلا کی عوام کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہوگئے۔ ملک کے باہر مقیم ہندستانیوں اور انسانی بھائیوں نے تعمیر نو میں حصہ لے کر آدم وحوّا کی اولاد ہونے کا حق ادا کیا، اکا دکا ایسے بھی واقعات رونما ہوئے، جس میں کچھ سیاسی پارٹیاں سیاسی روٹیاں سینکنے تعصب اور نفرت سے لوگوں کو بانٹنے کی کوشش کی۔ یہ انسانیت اور اخلاق کے مغایر ہے، ایسے وقت میں سیاست اور نفرت کا ماحول کھڑا کرنا یہ انسانیت اور ملک کے لیے نقصاندہ ہے۔

۵ ستمبر کو ڈاکٹر سروی پلی رادھا کرشنن سابق صدر جمہوریہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یوم اساتذہ کے نام پر منایا جاتا ہے، کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ میری سالگرہ نہ منائی جائے بلکہ اسے ٹیچرڈے سے موسوم کیا جائے۔ ظاہری بات ہے کہ اساتذہ ہی قوم وملت کے سب سے اہم اثاثہ ہیں اور وہی مستقبل کے معمار ہیں۔ آج حکومت کی غلط حکمت عملی کی وجہ سے اکثر وبیشتر اساتذہ باصلاحیت ہونے کے باوجود پیشہ تدریس کی توہین کررہے ہیں، جس کی وجہ سے مجبوراً عوام پرائیوٹ ادارے کا رخ کرتے ہیں اور پرائیوٹ اداروں کا حال یہ ہے کہ وہ اساتذہ کا استحصال کرتے ہیں۔ ہر دونوں صورتوں میں ملک وقوم وملت کا نقصان صاف طور پر عیاں ہے اس معاملے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہندستان اور دنیا کا مستقبل روشن ہو۔

ہندستان بلا لحاظ وملت ذات برادری کے اعلیٰ اقدار کا حامل ملک ہے۔ ہندستانی سماج میں ہم جنس پرستی کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ مغربی پیداوار ہے۔ کورٹ کے فیصلے سے مٹھی بھر افراد خوش ہوئے ہوں گے، لیکن ہندستان کی اکثریت بہت دکھی ہے۔ فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ملک سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں اور علماؤں کی زمین ہے، جس میں مذہبی اقدار کی ہر طرح سے پاسداری کی جاتی ہے۔

حکومت تلنگانہ نے ایک مرتبہ پھر مولانا محمد رحیم الدین انصاری صاحب کو اردو اکیڈمی کے منصبِ صدارت پر فائز کیا ہے۔ ادارہ پرامید ہے کہ موصوف کی صدارت میں اردو کا فروغ ہوگا۔ ادارہ آپ کی خدمت میں صمیمِ قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نعت شریف

اقبال سہیلؔ

کتابِ فطرت کے سرورق پہ جو نامِ احمد رقم نہ ہوتا
تو نقشِ ہستی اُبھر نہ سکتا، وجودِ لوح وقلم نہ ہوتا

یہ محفلِ کُن فگاں نہ ہوتی جو وہ امامِ اممؐ نہ ہوتا
زمیں نہ ہوتی فلک نہ ہوتا، عرب نہ ہوتا عجم نہ ہوتا

ترے غلاموں میں بھی جو تیرا ہی عکسِ شانِ کرم نہ ہوتا
تو بارگاہِ ازل سے ان کا خطاب خیرالامم نہ ہوتا

ہر اک سویدائے دل سے پیدا جھلک محمدؐ کے میم کی ہے
دل اس کی خلوت سَرا نہ بنتا جو نقش یہ مرتسم نہ ہوتا

اگر نہ کرتا وہ کنزِ مخفی، جمالِ وحدت کی پردہ داری
تو آب وگِل کے اِس آئینے میں ظہورِ نورِ قدم نہ ہوتا

نہ ہوئے حق سے نقاب اُٹھتا نہ ظلمتوں کا حجاب اٹھتا
فروغ بخشِ نگاہِ عرفاں، اگر چراغِ حَرم نہ ہوتا

کمالِ انسانیت کا پیکر جمال وحدانیت کا مظہر
سوائے ذاتِ حضورِ انورؐ، کوئی خدا کی قسم نہ ہوتا

سوائے صدیقؓ کون پاتا حضورؐ انور کی جانشینی
کہ وہ نہ ہوتے تو یوں جہاں میں بلند دیں کا عَلَم نہ ہوتا

اَریکہ آرائی نبوت کا فخر فاروقؓ ہی کو ملتا
جو سلسلہ وحیِ آسماں کا حضورؐ پر مختتم نہ ہوتا

خلافتِ راشدہ کا منصب اگر نہ ہوتا نصیبِ عثمانؓ
تو دفترِ وحیِ آسمانی، مُرتّب ومنتظم نہ ہوتا

زہے علوئے مقامِ حیدرؓ خوشی میں کہتے تھے خود پیمبرؐ
کہ فتح ہوتا نہ حِصنِ خیبر جو آج یہ ابنِ عَم نہ ہوتا

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

پروفیسر مظفؔر علی شہہ میری
وائس چانسلر مولوی عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول (آندھرا پردیش)

غزل

دریا کی بات کر نہ سرابوں کی بات کر
آتش فشاں پھٹا ہے عذابوں کی بات کر

اپنے چمن میں کھل کے ہمیں سانس لینے دے
رنگوں کی خوشبوؤں کی گلابوں کی بات کر

تیرے ہی کام آئیں گے گر تو تراش دے
ہم سے قلم کی اور کتابوں کی بات کر

اڑنا ہے ہم کو وسعتِ افلاک سے پرے
زاغ و زغن کو چھوڑ عقابوں کی بات کر

میرے سوال مجھ پہ مظفؔر نہ داغ تو
جو دے سکا نہ ان ہی جوابوں کی بات کر

قسط:(۴) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ

ڈاکٹر ایس آر تیموری

عبدالرزاق کان پوری کی کتاب یادِایام کا مقدمہ ڈاکٹر ایچ ،آر ا تیموری نے لکھا ہے۔ یہ محکمہ آثار قدیمہ بھوپال کے سپر نٹنڈ نٹ تھے،اس سے زیادہ ان کے متعلق معلومات دستیاب نہیں۔

یادِایام کے مقدمہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک مستشرق پروفیسر دیمیری نے اپنی کتاب ''ویسٹرن کلچر ان ایسٹرن لینڈ'' میں برطانوی ہندستان کے مصنفین کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ برٹش انڈیا میں جس قدر ادیب اور مصنف پیدا ہوئے ان میں تین ایسے اہل قلم تھے،جن کا طرز انشاء یورپ کے اسلوب کے مطابق ہے، اس میں ایک اہم نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔(یادِایام ص۹)

نواب سید علی حسن خاں

نواب سید علی حسن خاں (۱۸۶۶۔۱۹۳۶ء) نواب سید صدیق حسن خاں (۱۸۲۳۔۱۸۰۸ء) کے صاحبزادے تھے۔علوم مشرقیہ میں بڑا درک رکھتے تھے،مختلف مناصب پر فائز رہے اور متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں،مولانا شبلی کے خاص احباب میں تھے۔ بھوپال کے زمانہ قیام سے تعلقات کا آغاز ہوا پھر وہ لکھنؤ آ گئے تو دونوں کے تعلقات میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ علامہ شبلی سے ملنے اکثر آتے اور مولانا شبلی بھی ان کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے اور کئی کئی روز تک ان کے یہاں قیام کرتے جب کبھی اس میں تاخیر ہو جاتی تو نواب صاحب سواری بھیج کر علامہ شبلی کو بلواتے ،مولانا شبلی کی وفات کے بعد ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے مگر پھر مستعفی ہو گئے۔

ان کا بڑا علمی کارنامہ اپنے والد نواب صدیق حسن خاں کی مفصل سوانح عمری ہے جو مآثر صدیقی کے نام سے چار حصوں میں شائع ہوئی ہے، اس کا پہلا ایڈیشن جو مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔ اس میں نواب علی حسن خاں نے اصل حالات سے پہلے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ ان کے وسیع مطالعہ اور اسلامی علوم وفنون پر گہری نظر کا پتہ دیتا ہے۔ خاص طور پر فن تاریخ کا آغاز وارتقا پر انہوں نے جو بحث کی ہے وہ بڑی عالمانہ، اس میں انہوں نے فلسفہ تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ابن خلدون کو اس کا بانی قرار دیا ہے، پھر ہندستان کے مورخین پر تبصرہ کیا ہے اور اس میدان میں انہوں نے علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ میں تہذیب وتمدن سے مورخین کی بے اعتنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ فن تاریخ ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو فلسفہ اور عقلیات سے آشنا نہ تھے۔ اس فلسفہ تاریخ کے اصول ونتائج پر ان کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی، اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہندستان میں علامہ ممدوح پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فلسفہ تاریخ کے اصول روایت ودرایت پر اپنی تاریخی تصنیفات کی بنیاد رکھی اور جس دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کے ساتھ مختلف عنوانوں کے تحت میں انہوں نے نہایت مفید جزئی وکلی حالات کا استقصا کیا وہ انہیں کا حصہ تھا''۔

علامہ ممدوح کی تالیف وتصنیف نے ارباب قلم کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا اور اہل ہند میں تاریخی مذاق پیدا کر کے گویا ایک صلائے عام دیدی، اس لیے چند دنوں میں بہت سی سوانح عمریاں جمع ومرتب ہو کر مشتہر ہو گئیں اور تھوڑے عرصہ میں ایک عظیم الشان ذخیرہ واقعات اور اسلاف کے حالت کا فراہم ہو گیا''۔ (مآثر صدیق حصہ اول ص:۵)

مولوی عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰۔۱۹۶۱ء) نے اردو کی مدۃ العمر ایسی خدمت انجام دی کہ قوم نے انہیں بابائے اردو قرار دیا اور اب وہ اسی نام سے ہر لب پر ہیں اور شاید جب تک اردو زندہ رہے گی ان کی عظمت کا ذکر اسی طرح ہوتا رہے گا۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ علامہ شبلی کے علی گڑھ میں شاگرد رہ چکے تھے۔ خود انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی شاعر، ادیب اور مورخ تھے۔ ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہو جایا کرتا۔ وہ موقع بہ موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ اس کا حق ادا ہو جاتا تھا۔ جب میں مڈل میں پڑھتا تھا تو میں نے نجی طور پر عربی پڑھی تھی۔ علی گڑھ میں آ کر میں نے دوسری زبان فارسی لی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے فارسی لی، اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے استاد ملے''۔ (بحوالہ ادیب شبلی نمبر، ص:۱۴۔۱۵)

یہ اقتباس ان کے مضمون مطبوعہ ماہنامہ انشا کراچی اکتوبر ۱۹۵۹ء کا ہے۔ یعنی ان کے آخری دور کا ہے، لیکن اس سے پہلے انہوں نے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ ان کی حیثیت ہمیشہ ایک مخالف شبلی کی رہی۔ حیات شبلی میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جا و بے جا ان پر اعتراض کریں مگر کبھی انہوں نے (شبلی نے) اس کے سوا کہ ''یہ الزام صحیح نہیں'' ان سے کچھ نہیں کہا''۔ (حیات شبلی، ص، طبع جدید ۲۰۱۵ء)

سید صاحب کے اس خیال میں بڑی سچائی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا ایک بڑا ادبی کارنامہ قدیم کتابوں پر انتہائی محنت وتحقیق سے مقدمہ لکھنا بھی ہے، بلکہ ایک زمانہ میں وہ اس کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے، اس حوالہ سے انہوں نے اردو کی جو خدمت انجام دی اب وہ تاریخ ادب اردو کا قابل ذکر حصہ ہے، مگر انہوں نے کئی مقدمات میں علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے، نقد کیا ہے، ان کی حق تلفی کی ہے، حتی کہ تنقیص بھی کی ہے، غالباً ہجرت

تک ان کی یہی رویہ رہا، خاص طور پر ان کے مقدمات میں یہی رویہ ہے۔ ''مقدمات عبدالحق'' کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان کے چار مقدمات میں علامہ شبلی کا ذکر ہے۔

(۱) مقدمہ تذکرہ گلشن ہند۔۱۹۱۰ء

(۲) مقدمہ مثنوی خواب وخیال۔۱۹۲۶ء

(۳) مقدمہ تمدن ہند

(۴) مقدمہ خطوط شبلی۔۱۹۲۶ء

(۱) تذکرہ گلشن ہند:۱۹۱۲ء میں حیدرآباد میں (رود موسی) زبردست سیلاب آیا، اس نے بڑی تباہی مچائی، اس وقت مولانا شبلی وہیں حیدرآباد میں تھے، یہ سیلاب کسی اہل علم کا کتب بھی بہایا، اس میں جو کتابیں برآمد ہوئیں ان میں تذکرہ گلشن ہند کا مخطوطہ بھی تھا، جو مولوی غلام محمد صاحب مددگار، کیبنٹ دولت آصفیہ کے ہاتھ آیا، چنانچہ انہوں نے علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں پیش کیا جو اس وقت ناظم سررشتہ علوم وفنون اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر مولوی غلام محمد صاحب کی خواہش تھی کہ اسے ایڈٹ کر کے انجمن کی طرف شائع کیا جائے مگر بقول عبداللہ خاں ذمہ دار کتب خانہ آصفیہ ''انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے نہ چھپ سکی''۔ (التماس گلشن ہند، ص:۲) اس کے بعد علامہ شبلی سررشتہ علوم کی نظامت اور انجمن ترقی اردو سے مستعفی ہو گئے تاہم گلشن ہند کی طباعت واشاعت کا خیال ان کے دل سے نہ گیا، چنانچہ انہوں نے اس کی تصحیح ومراجعت کی، حواشی لکھے، وضاحتی وتشریحی نوٹ لکھے، بعض اضافے کیے، املا کی تصحیح کی (معارف اکتوبر ۱۹۲۰ء ص:۲۶۲) اور اسے عبداللہ خاں کے حوالہ کیا اور ان سے طباعت واشاعت کی خواہش ظاہر کی۔ (ایضاً)

گلشن ہند کی تدوین کی یہ کوشش نہ صرف علامہ شبلی بلکہ اردو میں متنی تحقیق کی پہلی کوشش تھی اور اس کے آغاز کا سہرا شبلی کے سر ہے، اس کوشش کا اگر ذکر کیا گیا ہوتا تو اردو متنی تحقیق وتنقید کا بنیاد گزار شبلی کو قرار دیا جاتا مگر مولوی عبدالحق نے اسے مٹا کر اپنے شبلی سے یہ تاج فضیلت چھین لیا۔ ہوا یوں کہ جب علامہ شبلی حیدرآباد سے لکھنؤ آ گئے تو عبداللہ خاں نے اس کا ذکر مولوی عبدالحق سے کیا، چنانچہ انہوں نے شبلی کے مقدمہ کو ہٹا کر اپنا مفصل مقدمہ اس میں شامل کیا، جس میں شبلی کی کاوشوں کا ذکر نہیں، اس میں جو حواشی شامل تھے، ان کی نشاندہی نہیں کی بلکہ اس کے برعکس ان پر تنقید کی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ گلشن ہند مشمولہ آثار شبلی (ص ۳۷۱۔۳۸۹) مطبوعہ دارالمصنفین اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۳ء)

تذکرہ گلشن ہند کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے طبع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن مع گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

تذکرہ گلشن ہند میں خواجہ میر اثر (م:۱۷۹۵ء) کے تذکرہ مرزا علی لطف نے ان کی مثنوی خواب وخیال کا ذکر کیا ہے اور بطور نمونہ چند اشعار بھی نقل کیے ہیں، علامہ شبلی نے مثنوی خواب وخیال کے بارے میں مولانا حالی ۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) کے موقف پر نقد کیا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''مولوی حال صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ (مقدمہ شعروشاعری) میں لکھنؤ کی شاعری پر صرف نواب مرزا شوق کی مثنوی کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لیے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں، اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ بن سکتی ہے؟''۔ (گلشن ہند، ص:۳۲)

علامہ شبلی کے موقف کی تردید میں بابائے اردو کی تنقید ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا، حالانکہ حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی

انکارنہیں ہوسکتا اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس میں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کی جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے۔ مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی ہے۔ عام شاعری پر یا اردو شاعری کے نشو ونما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر کیا ہے اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کرلیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا، اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں، تنقید کے روادار نہیں، مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید پر پہلا مقدمہ ہے، اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے وہ صرف ذوق سلیم اور حالی دماغ کا نتیجہ ہوسکتی ہیں تو لوگوں کو ان کے عام (بلکہ میانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے، یکا یک متزلزل ہوگئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا رہوا ہے۔ مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لیے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے بلکہ درحقیقت وہ اس مرتبہ کی مستحق نہیں ہے، جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کردیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پوری قلعی کھل جائے، حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں''۔ (مقدمہ گلشن ہند، ص:۱۹۔۲۰)

اس طویل اقتباس میں اصل بحث کے سوا کئی امور قابل غور ہیں مثلاً وہ شبلی کو ہر جگہ مولوی اور حالی کو ہر جگہ مولانا لکھتے ہیں، حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ مولانا کون تھا، یہی نہیں شبلی کی تنقید کی وجہ سے وہ ان کے علم وفضل پر حملہ آور ہوتے ہیں، ان کے مذاق سلیم پر پہلے شبہ کرتے ہیں، پھر اسے عامیانہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، پورا اقتباس شبلی کی ہجو ملیح ہے، حالانکہ معاملہ صرف اتنا ہے کہ مولانا حالی نے بغیر نام لیے دبستان لکھنؤ پر سخت چوٹیں کیں، گو انہیں نے دبستان کی تخصیص نہیں کی ہے مگر ان کی زد پر زیادہ لکھنؤ ہی ہے۔ اس کے خلاف تو بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چکبست نے تو متعدد مقامات پر حالی کے جوابات لکھے اور ان پر تنقید کی۔

جہاں مثنوی خواب وخیال کے متعلق علامہ شبلی کے نقطہ نظر کا معاملہ ہے وہ صرف اتنا ہے کہ مثنوی خواب وخیال کے بعض اشعار سے اگرچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب مرزا شوق نے اس سے استفادہ کیا تھا تاہم حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ گلشن ہند میں اس کے جو اشعار درج ہیں ان سے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ مرزا شوق کی مثنوی اس سے مستفاد ہے۔ اس سے علامہ شبلی کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

اس طرح بابائے اردو کے اس خیال سے کہ مولانا حالی نے میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ انیس ودبیر میں اتنا نہیں سراہا، کس قدر جذباتیت اور خلاف واقعہ بات ہے، ان کا ادعا دیکھیے کہ مثنوی گلزار نسیم کا اردو زبان سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ چکبست نے گلزار نسیم کا دیباچہ لکھا تو بعض مسائل میں علامہ شبلی سے خط وکتابت کی، چکبست نے اپنے مقدمہ میں جہاں مولانا حالی کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں، اس کے حاشیہ میں شبلی کے خط کا ایک سطری اقتباس نقل کیا ہے کہ ''گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے''۔ (دیباچہ گلزار نسیم، بحوالہ مضامین چکبست ص:۱۴۴، انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۷ء)

مولانا انصار احمد معروفی
پورہ معروف، ضلع مئو، یوپی

کتابوں کا ذوق

ایک وہ بھی زمانہ تھا، جب ایک دوسرے سے پوچھ پوچھ کر یہ معلوم کیا جاتا تھا کہ کون سی نئی کتاب چھپ کر آئی ہے؟ اور اس نئی کتاب کے بارے میں مبصرین وناقدین کیا کہتے ہیں، ساتھیوں سے یہ پتہ کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں سے ملے گی؟ اس کی قیمت کیا ہے؟ باذوق قارئین پیسے جمع کر کے نئی اور پرانی کتابیں خریدتے تھے، ماہانہ ادبی ،نیم ادبی، اور فلمی رسائل خرید کر پڑھتے تھے، موقعہ نکال کر اس کا مطالعہ کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے، سفر کے لئے اگر نکلنا ہوتا تھا تو اپنے بیگ میں دیگر سامانوں کے ساتھ کسی کتاب اور جریدہ کے لئے ضرور جگہ نکالتے تھے، کچھ نہیں تو کسی بڑے اسٹیشن پر اتر، یارک کر پلیٹ فارم پر موجود بک اسٹال کا ضرور چکر لگا آتے، اور وہاں ہلکے پھلکے رسائل ضرور مل جایا کرتے تھے، اس طرح سفر بڑی آسانی اور محبت سے گزر جاتا، اسی مجلّہ کے توسط سے دوسرے باذوق لوگوں سے رابطہ بھی ہو جایا کرتا، ادبی وسیاسی مسائل زیر بحث آجاتے، اور سفر کی یہ معمولی دوستی کبھی دیرینہ رفاقت اور تعلق میں بدل جاتی۔

ہمیں یاد ہے جب سفر میں اپنی سیٹ مل جاتی، اور بیگ تک ہاتھ پہنچ جاتا تو سب سے پہلے ہم اس میں سے اپنی پسند کی کتاب ہی نکالتے، اس کے بعد وقفہ وقفہ سے وہاں بیٹھے دیگر مسافروں پر چور نظروں سے دیکھتے بھی رہتے، کہ وہ لوگ اس کتاب کی جانب دیکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اس دوران کئی لوگ اردو سے دل چسپی ظاہر کرنے کے لئے اس کتاب کے نام کو زور سے پڑھ کر اپنی اردو دانی کو واضح کر دیتے، اور ساتھ ہی اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اپنی چھپی چاہت کا اظہار بھی، کبھی کہہ دیتے کہ اچھا یہ فلاں صاحب کی لکھی ہوئی کتاب ہے؟ ذرا دیکھیں، ہم نے ابھی تک اس کو دیکھا بھی نہیں ہے، پھر وہ اس کتاب کی فہرست پر ایک نظر ڈال کر اس کے افسانوں کا جو مطالعہ شروع کر دیتے تو ہمیں ایسا لگتا کہ انھوں نے ہی اس کتاب کو پانچ روپئے کے کثیر صرفے سے خریدی ہے، اور اب اس کے پڑھنے کا وقت ملا ہے۔ مجبوراً ہم دوسری نئی کتاب نکال لیتے، اور کتاب کے ساتھ اس نئے قاری کا بھی مطالعہ شروع کر دیتے۔

ہم جب اپنے کسی دوست کے یہاں ملنے جاتے ہیں تو اس کی ذاتی لائبریری کے دیکھنے کی خواہش کا ضرور اظہار کر دیتے ہیں ،اس میں دو فائدے چھپے ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ اپنے مطالعے کے ذوق کی تسکین کے سامان کی مفت فراہمی ہو جاتی ہے، کیوں کہ کتاب کو مانگنے میں شرم وحیا کو صدیوں سے بالائے طاق رکھنے کا جو رواج چلا آرہا ہے، اس روایت کو آگے بڑھانا بھی ہوتا ہے، دوسرا فائدہ اس میں یہ کہ اس زیارت سے یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ان کے یہاں میری کون کون سی کتاب میری لاعلمی میں آکر آرام کر رہی ہے؟ جسے وہ چند دن کے لئے مانگ کر لائے تھے؟ اور واپسی کی شرط والے کاغذ پر ان کے دستخط موجود تھے۔ جسے میں خود فراموش کر چکا تھا اس طرح ایک دوسرے سے بدلہ لینے میں بڑا لطف ملتا تھا، کتاب کی چوری کو بھی نہ جانے چوری کے زمرے میں شامل پہلے بھی نہیں کیا جاتا تھا اور اب بھی وہ روایت آہستہ ہی سہی پیش قدمی کر رہی ہے، آہستہ اس لئے کہ اب مطالعے سے دل چسپی میں ہی کمی آگئی ہے۔

ایک صاحب بڑے باذوق نکلے، وہ ہماری لائبریری میں روزانہ کتاب لینے کے سلسلے میں آتے جاتے تھے، اپنے ساتھ وہ ایک جھولا لانا کبھی نہ بھولتے تھے، دارالمطالعے میں وہ بہت کم

رکتے تھے،دوا یک کتاب نکالتے،اس کی انٹری کراتے،اور دیگر کتابوں کوایک نظر دیکھنے کے بہانے بہت ساری کتابیں نظر بچا کراپنے بیگ میں رکھ لیتے،مگروہ جتنی تیزی سے ہمارے یہاں آئے،اتنی ہی تیزی سے کتابیں لائبریری میں کم ہونی شروع ہوگئیں،ہم لوگ ان سے بہت خوش فہمی میں تھے کہ بڑے باذوق اوروقت کے قدردان ہیں،باالآخران کی تیز رفتاری کودیکھ کران پرشبہہ ہوگیا کہ ہونہ ہویہی کتابیں منتقل کررہے ہیں،ایک دن ان کے گھرکسی بہانے ہم چلے گئے دیکھاتوسارامعاملہ کھل گیا،وہ ساری کتابیں ان کی لائبریری میں پڑی تھیں،ہمیں یہ سب دیکھ کر بڑاتعجب ہوا،وہ بھی شرمندہ ہوگئے،ہم نے کہاکہ جب ہماری ساری کتابیں یہیں آگئی ہیں توبہتر ہے کہ اب لائبریری کابورڈ بھی یہیں لگوالیجئے۔

ڈاکٹرشکیل احمدڈائرکٹر ریسرچ اسکالراسکول منونے اپنی کتاب میں اپنے استاد پروفیسرمحمودالٰہی کے ذکرخیر میں ایک جگہ لکھاہے کہ

''ایک روزکتابوں کی چوری
کاذکرچھڑگیا،ڈپارٹمنٹ میں موجودلوگوں نے اپنے تجربے
بیان کئے،فارسی شعر ؎
دیوان ظہیرفاریابی۔۔۔درمکہ بدزدگربہ یابی
تک بات پہنچی توفرمایا''جناب!میرے ساتھ بھی بڑادلچسپ واقعہ ہوا،سنئے!میرے پاس ایک کتاب تھی جوسچ مچ نایاب تھی،شہرکے ایک صاحب کومعلوم ہوگیا،بضدہوگئے کہ میں انہیں مطالعہ کے لئے ضروردوں،وعدہ کیاکہ ہفتہ عشرہ میں واپس کردوں گا،میں نے اس تاکیدکے ساتھ کتاب ان کے سپردکردی کہ وعدے کے مطابق واپس کردیجئے گا،آپ کامعاملہ ہے ورنہ میں ایسی کتابیں کسی کونہیں دیتا،کئی ماہ گزرگئے،کچھ پتہ نہ چلا،توجھے تشویش ہوئی،کسی کی زبانی یاددہانی کرائی،ملاقات ہوئی توپھرتقاضاکیا،خیرکسی صورت پانچویں مہینے کتاب لے کرحاضرہوئے اورمجھے سپردکرتے ہوئے بولے''ڈاکٹرصاحب!آپ کامعاملہ ہے تب میں یہ کتاب آپ کو دے رہاہوں ورنہ یہ نایاب کتاب میں کسی کونہیں دیتا،،مطالعے کے بعدکسی سے بھجوایئے نہیں، میں خودلینے کے لئے حاضرہوجاؤں گا،میں نے کتاب اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ان سے عرض کیا''جناب!آپ کواس کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی،،کتاب اب اصل اپنے مالک کے

صوفی سیدعبدالرحیم واعظ کامل اجمیری۔حیدرآباد

غزل

پہلے ہر لفظ تولیے صاحِب
پھر زباں اپنی کھولیے صاحِب
لبِ لالی تو کھولیے صاحِب
مشک باتوں میں گھولیے صاحِب
آج تو واقعی اداس ہیں ہم
میٹھے لہجے میں بولیے صاحِب
آستینے سنبھال کر رکھیے
ہر طرف ہیں سپولیے صاحِب
سچ کے اظہار میں تکلف کیا
جب زباں ہیں تو بولیے صاحِب
اپنے نازک مزاج کامؔل سے
میٹھے لہجے میں بولیے صاحِب

پاس پہنچ گئی ہے، یاد کیجئے! پانچ ماہ قبل میں نے یہ کتاب آپ کو صرف ہفتہ عشرہ کے لئے مستعار دی تھی،، (از سمٹتا سائبان ،ڈاکٹر شکیل احمد، مئو، ص نمبر ۳۰)

کتاب کے رسمِ اجرا سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نئی کتابیں چھپ رہی ہیں، اور ابھی اتنی لوگوں میں ہمت اور سرمایہ ہے کہ وہ قارئین کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے اپنی پونجی کو داؤ پر لگا سکتے ہیں، انہیں شاید معلوم نہیں کہ موبائل اور انٹرنیٹ وغیرہ کی دلچسپیوں میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو گیا ہے، آبادیاں بڑھ رہی ہیں اور قارئین کا گراف نچلی سطح تک پہنچ گیا ہے، اگر لوگوں میں کچھ پڑھنے کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو بس وہی عام فہم تفریحی کتابیں جسے لوگ ''لوکل کتاب،، کہتے ہیں، ایک صاحب جو لوکل کتاب کو بھی چھوڑ چھاڑ کر صرف جذبات ابھارنے والی کتابیں پڑھتے تھے، ان سے ہم نے کہا کیا وجہ ہے کہ اب آپ فلاں فلاں افسانوی کتابیں نہیں پڑھتے؟ بولے کہ مجھے ایسی کتابیں دستیاب ہو گئی ہیں جنھوں نے ان سے بے نیاز کر دیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ بولے کچھ نہیں، بس یہ کہ افسانوی ادب میں افسانہ نگار جن باتوں کو کہہ نہیں پاتے تھے، اور جس موڑ پر جا کر جذبات کے اظہار کے لئے ان کے پاس الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے تھے وہاں سے ہمارے فلاں رائٹر شروع کرتے ہیں، اس واقعہ کو جسے عام قلم کار الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتے تھے انہیں وہ ایسا بے جامہ کر دیتے ہیں کہ بس ہم اینٹھ کر رہ جاتے ہیں۔

ہماری عادت ہے کہ ہم جہاں کسی کتاب کا اجرا ہوتا ہے وہاں بلائے، بن بلائے ضرور پہنچ جاتے ہیں، لوگ اس حاضری کو ہماری اردو ادب سے بے پناہ محبت سے تعبیر کرتے ہیں ایسا نہیں کہ ہمارے یہاں وقت ہی وقت ہے اور ہم گھر کے بیکار ہیں، نہیں مصروفیت کے باوجود کرایہ لگا کر جانے اور وہاں جا کر مفت کتاب کا نسخہ ہاتھ لگ جانے کا جب ہم نے موازنہ کیا تو ہمیں یہ سستا سودا معلوم ہوا، بعض چھوٹی کتاب ہوتی ہے تو کئی عدد ہم لے کے چلے آتے ہیں اور اس طرح ہم اردو زبان و ادب کے قارئین میں اضافہ کا سبب بننے کیساتھ اس کی توسیع و اشاعت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں ، اگرچہ ہم مائک سے ضرور اعلان کر جاتے ہیں کہ لوگ اس کو خرید کر پڑھیں تا کہ کم از کم اس پروگرام کا خرچ تو نکل آئے، کتاب کی قیمت وصول ہو نہ ہو۔

علیناؔ عترت - غازی آبادیوپی

غزل

زندہ رہنے کی یہ ترکیب نکالی میں نے
اپنے ہونے کی خبر سب سے چھپالی میں نے
جب زمیں ریت کی مانند سرکتی پائی
آسماں تھام لیا جان بچالی میں نے
اپنے سورج کی تمازت کا بھرم رکھنے کو
نرم چھاؤں میں کڑی دھوپ ملالی میں نے
مرحلہ کوئی جدائی کا جو در پیش ہوا
تو تبسم کی ردا غم کو اڑھا لی میں نے
ایک لمحے کی تری سمت سے اٹھا بادل
اور بارش کی سی امید لگالی میں نے
بعد مدت مجھے نیند آئی بڑے چین کی نیند
خاک جب اوڑھ لی جب خاک بچھالی میں نے
جو علیناؔ نے سر عرش دعا بھیجی تھی
اس کی تاثیر یہیں فرش پہ پالی میں نے

ڈاکٹر ناظر حسین خان
گھورکھپور اتر پردیش

ناموران ہند کو نذیرؔ بنارسی کا خراج عقیدت

نذیرؔ نے ہندوستان کی جن شخصیات کو اپنی شاعری کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کی ہے ان میں بھگوان مہاویر، گرونانک، کالی داس، کبیر داس، تلسی، بہادر شاہ ظفر، رانی لکشمی بائی، تاتیہ ٹوپے اور بھارتیندو ہریشچندر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس سلسلے کا سب سے پہلا نام بھگوان مہاویر کا ہے۔ نذیرؔ بنارسی نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

گماں آکاش کا ہوتا ہے ویشالی کی دھرتی پر
نیا سورج نکل آیا پرانی راجدھانی میں

آکاش سے مراد چھایا دینے سے ہے، ویشالی کی دھرتی یعنی ان کی جائے پیدائش۔ سورج کا نکلنا یعنی ساری دنیا میں روشنی پھیلانا، پرانی راجدھانی یعنی ویشالی قدیم دور میں ہندوستان کی راجدھانی رہا ہے۔ بھگوان مہاویر جین دھرم کے چوبیسویں گرو تھے۔ اس دھرم کے سبھی گروؤں میں سب سے زیادہ شہرت مہاویر صاحب کو ملی۔ انھوں نے عدم تشدد کو سب سے بڑا دھرم مانا۔ اس کے علاوہ انھوں نے جین دھرم کی بہت خدمت کی اور اسے ایک بلند مقام عطا کیا، اگر ہم یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ بھگوان مہاویر نے اس دھرم کے ماننے والوں کے لیے ایک نئے سورج کا کام کیا۔ ایسا سورج جو نہ صرف اس دھرم کے لوگوں کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک نئی روشنی لے کر آیا۔ لفظ آکاش کا استعمال یعنی آکاش ہر کسی کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، اس کے یہاں اونچے اور نچلے طبقے کو لے کر کوئی تعصب نہیں، وہ ہر نفس کو اپنے سائے میں رکھتا ہے۔ بھگوان مہاویر کا کردار بھی اسی آکاش کی طرح تھا۔

اس شعر میں شاعر نے بھگوان مہاویر کو آکاش اور ان کی شخصیت کو نیا سورج کہا ہے، اس لیے یہاں استعارہ ہوگا۔

جوانی ایسا موسم ہے کہ سب سے چوک ہوتی ہے
مگر تم نے تو کیول گیان پایا ہے جوانی میں

بھگوان مہاویر کا ذہن بچپن سے ہی ترک دنیا کی طرف مائل تھا۔ ان کے والد کو اسی بات کا خدشہ تھا، اس لیے انھوں نے بچپن میں ہی ان کی شادی کر دی۔ ان کی ایک لڑکی بھی تھی، اس کے باوجود گھریلو زندگی میں ان کا من نہیں لگا۔ ۲۸ برس کی عمر میں گھر چھوڑ دیا اور صوفیوں کی زندگی اختیار کر لی اور بہت سخت ریاضت کی۔ شاعر نے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جوانی کے عالم میں تقریباً سبھی نوجوان طبقے کے لوگ دنیاوی زندگی میں مشغول ہو جاتے ہیں، مگر اس عالم میں انھوں نے اپنی پوری زندگی سخت ریاضت میں گزار دی۔

تمھارے ایک ایک سندیش میں ہے درد انساں کا
حقیقت سانس لیتی ہے تمھاری ہر کہانی میں

بھگوان مہاویر نے جو بھی سندیش دیے ہیں ان میں انسانی درد عیاں ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر نچلے طبقے کے لوگوں کے ساتھ ہو رہے مظالم کو بہت قریب سے دیکھا اور اسے محسوس کیا۔ اس لیے ان کے ذریعہ جو بھی سندیش عوام کو دیا گیا اس میں ایک حقیقت دیکھائی دی۔

اس ضمن میں اگلا نام گرونانک کا ہے۔ گرونانک سکھوں کے پہلے گرو ہیں، ان کی پانچویں شتابدی پر بنارس میں سکھوں نے ایک جشن کا انعقاد کیا۔ ہر طرف خوشی کا ماحول تھا، ایسے میں نذیرؔ بنارسی کا قلم کیسے خاموش رہتا۔ انھوں نے اپنے قلم کو ہلکی سے جنبش دی اور گرونانک کی شان میں 'بابا گرونانک کی پانچویں شتابدی پر' کے عنوان سے ایک نظم ادب کو تحفے کی شکل میں ملی، نظم کا

پہلا بند ملاحظہ فرمائیے:

نہانے اترا ہے پونم کا چاند پانی میں
نہ سورگ سانس لے کیوں رات کی جوانی میں
اضافہ کیوں نہ ہو گنگا تیری روانی میں
گرو کا جشن ہے شنکر کی راجدھانی میں
قریب ہے جو گرو باغ آستانے سے
ہوائیں کاشی میں آتی ہیں نان کانے سے

گرونانک نے ہرکسی کو انسانیت کی تعلیم دی، سچ کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ کیا، شاعر بھی نانک کی انھیں خوبیوں کا طالب ہے۔

ہر آدمی کو جو تعلیم آدمیت دے
ہر ایک رند کو ستسنگ کی جو دعوت دے
جو دیس واسیوں کو دیس کی محبت دے
بغیر جام کے جو قلب کو حرارت دے
باب چھیڑ کے مردانۂ گرونانک
مجھے پلا وہی پیمانۂ گرونانک

اس کے علاوہ انھوں نے پوری دنیا کو یکجہتی کا پیغام دیا اور سب کو ایک ڈور میں باندھنے کی کوشش کی، یہ بند اس حقیقت کو واضح کرتا ہے:

نئے سرے سے محبت کا اہتمام کیا
ہر اک شراب کو تم نے شریک جام کیا
ہر ایک مذہب و ملت کا احترام کیا
جو کام کر نہ سکا کوئی بھی وہ کام کیا
وہ مئے پلائی کہ ہوش آگیا زمانے کو
سلام رندوں نے بھیجے گروگھرانے کو

گرونانک کی ان تمام خوبیوں کی بنیاد پر شاعر نے ان کو ہندوستان کی شان بتایا ہے:

وفا کی روح صداقت کی جان ہو بابا
ہمالہ کی طرح سے مہان ہو بابا
خدا گواہ خدا کی امان ہو بابا
مرے وطن کی حقیقی نشان ہو بابا
ادائے فرض بہ صد احترام کرتا ہے
تمھیں صفیرِ بنارس سلام کرتا ہے

گرونانک نے عوام کو جو پیغام دیا کہ 'سب کا مالک ایک ہے' ان کا یہ تصور اسلامی تصور سے میل کھاتا ہے، اس لیے نذیر نے سکھوں سے اپیل کی ہے کہ گرونانک صرف تمھارے ہی نہیں بلکہ ہمارے بھی ہیں اور ان کی کتاب 'گروگرنتھ' سبھی قوموں کے لیے امانت ہے، یہ بند ملاحظہ فرمائیے:

کہاں ہو ائے گرونانک کے قفس بردارو
نہیں تمھارے ہی سر سہرا اونچی دستارو
ہمیں بھی ساتھ لو بابا کے ائے علم دارو
فقط تمھاری ہی دولت نہیں ہے سردارو
طرح طرح سے ہے مرقوم حمد اس رب کی
گروگرنتھ امانت ہے سب کے مذہب کی

اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے نذیر نے اگلی خراج عقیدت کالی داس کو پیش کیا ہے۔ سنسکرت زبان میں کالی داس کی نظمیں اور ڈرامے اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں، ان کی سات تخلیقات ہیں جن میں تین ڈرامے اور چار طویل نظمیں ہیں۔ ابھگیان شکنتلم، وکرم آروشی اور رتو سمہار وغیرہ کا شمار ڈراموں میں اور رگھووَنش، کمار شمبھو، میگھ دوت اور رتو سمہار وغیرہ کا شمار نظموں میں ہوتا ہے۔ نذیر بنارسی نے ان کی تعریف اس انداز میں کی ہے:

ہر حسیں منظر کی آڑ میں گزر ان کا
ہنس پڑے ادھر جلوے رخ ہوا جدھر ان کا
ان کو سب سے ہے نسبت وہ ہیں شاعرے فطرت
ہر کلی میں دل ان کا پھول میں جگر ان کا

کالی داس کی سبھی تخلیقات میں سب سے زیادہ مقبولیت 'شکنتلا' کو ملی۔ اس کی مقبولیت اس درجے کو پہنچی کہ اس کا ترجمہ

یورپ اور جرمنی میں ہوا۔ اس ڈرامے کی تخلیق مہابھارت سے مواد حاصل کر کے اس میں ترمیم واضافے کے ساتھ کی گئی۔ یہ ڈرامہ راجہ دشینت اور شکنتلا کے عشق پر مبنی ہے۔ کالی داس نے اپنی تخلیقی قوت سے اسے زندہ جاوید بنا دیا۔ اس ڈرامے کی ایک سین راجہ دشینت اور شکنتلا کے ہجر کا ہے، جسے شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

چھا گئے ہیں دنیا پر بن کے درد کا بادل
آنسوؤں کی بھاشا میں لکھ گئے ہیں 'شاکنتل'
آشرم کی ویرانی غم اور اتنا طوفانی
کانپ کانپ اٹھے پنچھی، چینکھ چینکھ اٹھا جنگل
اک شکنتلا کا غم اور سب کی آنکھیں نم
پھوٹ کر رشی روئیں روئے ہرنیوں کا دل
لوگ پڑھتے جاتے ہیں ہوش اڑتے جاتے ہیں
عشق کی کہانی کیا، جو بنا نہ دے پاگل
سر جھکانا پڑتا ہے ایک ایک اپما پر
کالی داس چھائے ہیں آج ادب کی دنیا پر

اگلا نام سنت کبیر کا ہے۔ کبیر داس کے متعلق یہ بات عام ہے کہ یہ ایک ناجائز اولاد تھے، بدنامی کے ڈر سے ان کی ماں نے ان کو راستے میں رکھا تھا، جس کے بعد یہ نورو اور نعیما نام کے جولاہے کو ملے اور انھیں لوگوں نے ان کی پرورش کی (بعض کتابوں میں یہ بھی آیا ہے کہ کبیر داس انھیں کے لڑکے تھے)۔ نذیر صاحب نے اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

ایک ماں کے کلنک کا ٹیکا
لگ گیا تھا زمیں کے ماتھے پر
لہرتارا کے سونے راستے میں
ایک بچہ پڑا تھا لاوارث
اک 'نعیما' کو مل گئی نعمت
ایک 'نورو' کو نورعین ملا

نذیر بنارسی نے کبیر داس کی تاریخ کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر بہت ہی خوبصوتی سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ مثلاً جب کبیر نے رامانند سے اس بات کی گزارش کی کہ وہ انھیں اپنا شاگرد بنالیں، تو رامانند نے انکار کر دیا، پھر کبیر کو یہ پتا چلا کہ رامانند روزانہ صبح کو گنگا کے گھاٹ پر نہانے جاتے ہیں، تو کبیر ایک روز صبح کو اٹھ کر گھاٹ کی سیڑھیوں پر لیٹ گئے، جب رامانند نہانے کے لیے گھاٹ کی سیڑھیوں پر اتر رہے تھے اس وقت ان کا پیر کبیر کے بدن پر پڑا۔ اس واقعے کو شاعر نے شعری انداز میں یوں بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

یہی گنگا تھی جس کی لہریں آج
گا رہی ہیں کبیر کے دوہے
اسی گنگا کی ایک سیڑھی پر
آکے سوئی تھی دیش کی تقدیر
ایک ٹھوکر میں جاگ اٹھی قسمت
واہ رے رامانند کی ٹھوکر

کبیر داس کے متعلق یہ بات عام کر دی گئی کہ وہ ایک برہمن کے لڑکے ہیں مگر ان کی پرورش تو مسلم گھرانے میں ہوئی تھی، اس لیے دونوں قوموں کے ماننے والوں میں کبیر داس کو لے کو کافی محبت تھی اور یہی محبت فساد کی جڑ بھی، کیوں کہ دونوں قوم ان کو اپنا مانتی، مگر کبیر داس نے کسی ایک کا ہونے سے انکار کر دیا اور دونوں کو محبت کا پیغام دے کر انھیں یکجہتی کے ڈور میں باندھنے کی کوشش کی۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تھا مسلماں کے آبروؤں پر بل
تھی شکن برہمن کے ماتھے پر
اس نے واتاورڑ بدلنے کو
پورے ماحول سے بغاوت کی
سب کے غصے کی آگ سے کھیلا
دل میں طوفان انقلاب لیے
دل میں سب کے دلوں کی دھڑکن تھی
سب کی بھاشا نہ کیسے اپناتا
ایک مرکز پہ سب کو لے آیا

توڑ کر ذات پات کی دیوار
طے کیا اس نے ہر مقام بلند
اٹھ کے گنگا کی ایک سیڑھی سے
وہ نظر بندے دیر و کعبہ نہیں

ہندواور مسلم دونوں طبقوں میں ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کی موت کے بعد ایک طرف مسلم قوم کے لوگ ان کی لاش کو دفنانے کے لیے اڑے تھے تو دوسری طرف ہندو قوم کے لوگ جلانے کے لیے بضد تھے، مگر خدا کی قدرت کہ صبح جب دونوں فرقے کے لوگ ان کی آخری رسم کے لیے اکٹھا ہوئے تو ان کی لاش کی جگہ دو پھول تھے۔ ان اشعار کے ذریعہ یہ حقیقت یوں واضح ہوتی ہے:

مرنے والا نہ برہمن تھا نہ شیخ
صرف پیکر تھا آدمیت کا
آدمیت ہے ایسی شے جس کو
چھو سکا ہے نہ چھو سکے گا کوئی
لاش پر جب کھڑا ہوا جھگڑا
لاش پھولوں میں ہو گئی تبدیل
کوئی جسم کبیر چھو نہ سکا
پھول ہی پھول سب کے ہاتھ لگے
پھول گاڑے گئے جلائے گئے
وہ جلایا گیا نہ گاڑا گیا
اس کا مسلک تھا میل اور میلاپ
وہ تھا پروردگار یکجہتی
آج اس کی بہت ضرورت ہے
دیش کو بلکہ ساری دنیا کو

اس سلسلے کا اگلا نام بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ تھے۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے ذریعہ ان کی سلطنت کو تباہ کر دیا گیا۔ ان کی اس تباہی میں ان کے اپنے لوگوں کا بھی ہاتھ تھا، جن پر انھوں نے بھروسا کیا تھا۔ ان کے وہ مخلص جو انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھے انھوں نے ان کو دغا دی۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

چار دن کے واسطے آیا تھا روزِ امتحان
راز بن کر جو نہاں تھے، ہو گئے سب پر عیاں
مونس جاں بننے والے دشمن جاں ہو گئے
جتنے غدار وطن تھے سب نمایاں ہو گئے

جس وقت ظفر کو سبھی لوگوں کے ساتھ کی ضرورت تھی اس وقت ملک کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ دغا بازی اور لڑائیاں کر رہے تھے۔ نذیر کے یہ اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں:

آچکا تھا ہوش انگریزوں کی مکاری کے بعد
ہو گئے بے بس ظفر اپنوں کی عیاری کے بعد
فتح یابی پر شکستوں کی اداسی چھا گئی
اک نیا ہندوستاں گھر کی لڑائی کھا گئی

آزادی کی اس جنگ جسے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے میں انگریزوں نے نہ صرف ان کی سلطنت کو تباہ و برباد کیا بلکہ بدلے کے طور پر ان کے لوگوں کو بالخصوص مسلمانوں کو اپنے غصے کا نشانہ بنایا۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہر طرف تھا گرم انگریزوں کا جوش انتقام
چار جانب تھا محبان وطن کا قتل عام
کشتیۂ ہندوستاں کو دیکھ کر گرداب میں
ہچکیاں لیتی تھی جمنا خون کے سیلاب میں
کسر آزادی ہوا مسمار تیاری کے بعد
سب کے سب مجرم بنے شہ کی گرفتاری کے بعد
کتنے سر پھانسی پہ لٹکے کتنے سر کاٹے گئے
بے کفن لاشوں سے دہلی کے کویں پاٹے گئے

تباہی کا یہ منظر دلی کے ہر گلی کوچے میں دکھائی دے رہا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت دلی پوری طرح سے ویران

ہوچکی تھی، اس جنگ میں بادشاہ کے بیٹوں کا سر کاٹ کر ان کے سامنے پیش کیا گیا:

اس بہادر شاہ کو ہم دیکھیں یا اس کا جگر
اپنی آنکھوں جس نے دیکھے اپنے شہزادوں کے سر
اس کے ایک اک شعر سے جھلکے نہ کیوں رنگِ ملال
جان سے مارے گئے اک ساتھ جس کے تین لال

خود بادشاہ کو بھی ہندوستان کی مٹی نصیب نہیں ہوئی:

جان سے مارے گئے اک ساتھ جس کے تین لال
روح دہلی میں تھی جسم ناتواں رنگون میں
وہ مجاہد جس کو دفنایا گیا رنگون میں
آج تک اس کی محبت دوڑتی ہے خون میں
جس نے دو گز بھی زمیں پائی نہ کوئے یار میں
اس کی شہرت آج بھی ہے کوچۂ دلدار میں

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کا ایک اہم نام تاتیہ ٹوپے کا ہے، جنھوں نے پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کا مقابلہ کرکے ان سے لوہے کے چنے چبوائے۔ نذیر نے ان کی شخصیت کو شعری انداز میں یوں پیش کیا ہے:

تیرا کیا کہنا سپہ سالار نانا پھڑنویس
ویرتا سے ہے تیری گورومئی ہندوستاں
اس طرح انگریز گھبراتے تھے تجھ کو دیکھ کر
جیسے پورا کارواں ہو ایک فرد کارواں
ناز کرتی ہیں نئی نسلیں تیرے اتحاس پر
لاکھوں جانیں تجھ پہ صدقے اے وطن کے پاسباں
جس طرف کا رخ کیا اس سمت ہلچل مچ گئی
فتح کا پرچم گڑا ، تونے قدم رکھا جہاں

آزادی کی اس لڑائی میں انگریزوں کے مقابلے ہماری طاقت کمزور تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے اپنوں نے ہی ہمارے ساتھ غداری کی، اس لیے ہمارے مجاہدین کو اس جنگ میں مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا، مگر وہ پھر بھی نہ گھبرائے اور آخر میں ہنس کر پھانسی کے پھندے پر چڑھ گئے۔ تاتیہ ٹوپے کا نام بھی اسی صف میں آتا ہے:

حوصلے سے توڑ کر گھیرے فرنگی جال کے
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے
ظالموں تم تاتیہ ٹوپے کو کر سکتے ہو قید
لیکن آزادی کا جذبہ قید کر سکتے نہیں
مدھیہ بھارت کے مجاہد نے یہ بتلایا ہمیں
جن کو مٹ جانا نہیں آتا ابھر سکتے نہیں
جنگ آزادی کا ہیرو اپنا سینا تان کے
چڑھ گیا پھانسی پہ بھی ساون کا جھولا جان کے

ایسے نوجوان جنھوں نے ملک کے لیے ہنس کر اپنی جان دے دی ہے، ان کا نام رہتی دنیا تک تاریخ میں یاد کیا جائے گا، بھلے ہی جسمانی طور پر ہمارے سامنے حاضر نہ رہیں، مگر ان کی یاد دلوں میں اور ذکر زبان پر ہمیشہ رہے گا۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جان جو دیتے ہیں اپنی ماتر بھومی کے لیے
وہ گزرنے پر بھی دنیا سے گزر سکتے نہیں
سورما پھانسی پہ چڑھ کر تو اترتے ہیں مگر
دیش بھگتوں کے دماغوں سے اتر سکتے نہیں
آج بھی جو جان دیتے ہیں وطن کے واسطے
رہتی دنیا تک رہیں گے زندہ مر سکتے نہیں
جن کو آتا ہے امر ہونا وہ مر جانے پہ بھی
چھین لیتے ہیں، ازل سے زندگی کا بانکپن

تاریخ میں رانی لکشمی بائی کا نام اجنبی نہیں ہے۔ یہ وہی لکشمی بائی ہیں جنھیں جھانسی کی رانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں سے لڑتے ہوئے انھوں نے اپنی جان قربان کردی۔ ان کی جائے پیدائش بنارس ہے۔ اس سلسلے میں نذیر بنارسی فرماتے ہیں:

چپ ہوئی تاریخ جب آیا بنارس کا سوال

اس پرانے شہر نے دیکھے ہیں اتنے ماہ و سال
اپنے پیروں پر کھڑا ہے کب سے چپ سادھے ہوئے
مل نہیں سکتی کہیں اس بوڑھے سادھو کی مثال
گھاٹ پر وہ سر اٹھائے اونچی اونچی برجیاں
کرتی رہتی ہیں جو ہر دم شہریوں کی دیکھ بھال
جیوتشی ہیں آج بھی ، اور ایسے ایسے جیوتشی
دیکھ کر جن کو ستارے بھول جائیں اپنی چال
کیوں نہ جی اٹھیں اودھ کی شام کے مارے ہوئے
زندگی بکھرا رہا ہے صبح کاشی کا جمال
بالکہ ایک یاد آ جاتی ہے گنگا کی قسم
دل میں آجاتا ہے جب بھی دیش بھگتوں کا خیال
مسکرا کر ایک موج اٹھی تھی اسّی گھاٹ سے
زندگی لے کر بڑھی جو لکشمی کے ٹھاٹ سے

نظم کے اس بند میں شاعر نے بنارس کے تعلق سے مؤرخوں سے شکایت کی ہے کہ تاریخ میں اس قدیم شہر کو وہ اہمیت نہیں ملی جس کا یہ حامل ہے۔ شاعر نے اس شہر کی مثال اس بوڑھے سادھو سے دی ہے جو خاموش کھڑا ہو جو پوجا کرتا ہے۔ اس شہر کی جیوتشی کی تعریف میں شاعر نے بتایا ہے کہ ان کی علم کے آگے ستارے بھی اپنی چال بھول جاتے ہیں ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس شہر نے ملک کو ایک سے ایک جاں باز عطا کیے جنھوں نے ملک کی حفاظت میں اپنی جان قربان کر دی۔ ان میں ایک نام لکشمی بائی کا بھی ہے جن کا تعلق بنارس شہر سے تھا۔

۱۸۵۷ تک انگریز ہندوستان میں رفتہ رفتہ اپنی نیو مضبوط کر چکے تھے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے انھوں نے اس ملک کو اپنے قبضے میں لینا شروع کیا۔ جن حکمرانوں نے انگریزوں کے اس فیصلے سے انکار کیا انھیں اس کے ساتھ جنگ کرنی پڑی۔ انگریزوں کی اس حکمت کے تحت جھانسی بھی آئی۔ رانی انگریزوں کی نیت کو بھانپ گئیں۔ وہ ان کی اس حکمت کو برداشت نہ کر سکیں اور جھانسی کے حفاظت کے لیے انگریزوں سے جنگ کا اعلان کر دیا۔

اس سلسلے میں یہ بند ملاحظہ فرمائیے:

اک نظر میں بھانپ لی ہر اک فرنگی کی نظر
تخت پر وہ ، ہاتھ اس کا قبضۂ شمشیر پر
فوج کے روکے رکا ہے جوش آزادی کہیں
بڑھ گیا دریائے دل اس باندھ کو بھی توڑ کر
آ گیا آزادئ ہندوستاں کا جب سوال
بن گیا فولاد کا دل اور پتھر کا جگر
کر دیا پیغام جاری کمپنی والوں کے نام
کٹ تو سکتا ہے مگر اب جھک نہیں سکتا ہے سر
لاش پر تعمیر آزادی کھڑی ہونے کو ہے
ہیں کمر بستہ سپاہی ، توپچی سینہ سپر
شیرنی بھارت کی کڑکی ، بڑھ کے بجلی کی طرح
قلعۂ جھانسی پہ انگریزوں کا قبضہ دیکھ کر
جم گئی اپنے ارادے پر ہمالہ کی طرح
اور اٹھی آگ کی اٹھتی سی جوالہ کی طرح

اس انکار کی وجہ سے انھیں انگریزوں سے جنگ کرنا پڑی، جس کا ایک ہلکا سا نقشہ نذیر بنارسی نے یوں کھینچا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

گھن گرج توپوں کی اور گولوں کی دھود ھود ھائیں دھائیں
شہر بندوکوں کا جنگل ، گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں
جس طرف دیکھو ادھر حد نظر تک خون خون
لاش آگے ، لاش پیچھے، لاش دائیں ، لاش بائیں
اس کٹھن رستے پہ ہے رانی کا گھوڑا گامزن
سورما بھی اک نظر دیکھیں تو چھکے چھوٹ جائیں
اک بھیانک خامشی ہر ایک طرف گاتی ہوئی
موت کا خونی اندھیرا کر رہا ہے سائیں سائیں
راج ماتا کی نگاہوں میں اندھیرا چھا گیا
غوش خاں رخصت ہوا لیتا ہوا سر کی بلائیں
اپنا ننھا سا کنور سینے سے لپٹائے ہوئے
ہے خیال اس کا کہ انگریزوں کی نظریں کھا نہ جائیں

[آ نہ سکتی تھی مگر گھوڑا اڑا کر آ گئی
حکمراں جھانسی کی اب جھانسی کے باہر آ گئی

اس جنگ میں رانی انگریزوں سے بہت ہی بہادری سے لڑیں۔ شاعر نے ان کی دلیری کو شعری انداز میں یوں پیش کیا ہے:

موت سے کھلواڑ کرتی ، تیغ چمکاتی ہوئی
نارۂ حب وطن سے خون گرماتی ہوئی
اپنا بل دینے چلی ہے اپنے پیارے دیش پر
اپنی تہذیب اور اپنے بل پہ بلکھاتی ہوئی
وہ گرزتی جارہی ہے مست بادل کی طرح
بڑھتی جاتی ہے سروں کا مینھ برساتی ہوئی
گولیوں کی سنسناہٹ ہو کہ توپوں کی گرض
گیت آزادی کا ہر اک ساز پر گاتی ہوئی
مارتی ہے قہقہہ خونی فرشتے کی طرح
ظالموں کے خون سے شمشیر نہلاتی ہوئی
ویرتا کو دیکھ کر ، گمبھیرتا کو دیکھ کر
موت آآ کر پلٹ جاتی شرماتی ہوئی
فتح کرکے مسکرائی ہر فرنگی گھات پر
مالوے کی رات لے کر چھا گئی گجرات پر

بھارتیندو ہریشچندر کا تعلق بنارس سے تھا۔ یہ ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ ہندی ادب کو اس معیار تک پہنچانے والوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ نثر میں سنسکرت، عربی اور فارسی کے الفاظ نہ آئیں۔ ہریشچندر ایک ڈرامہ نگار تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندی ادب میں ڈرامہ نگاری کا آغاز انھیں کے ذریعہ ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو میں بھی شعر کہے۔ ان کی انھیں خوبیوں کی بنیاد پر لوگوں نے ان کو بھارتیندو (بھارت کا چاند) کا خطاب دیا۔ نذیر نے ان کو اپنے اشعار کے ذریعہ کچھ اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

درد سے بھر دے جو انسانوں کے دل
ہم کو اس کوئل کی کو کو چاہئے

جن سے جن سے دیش کی آئے گمک
ہم کو ان پھولوں کی خوشبو چاہئے
ٹوٹے رشتے جوڑنے کے واسطے
آج پھر اک بھارتیندو چاہئے
جس میں سب کا درد شامل ہو نذیر
آج آنکھوں میں وہ آنسو چاہئے

''ناموران ہند کو نذیر بنارسی کا خراج عقیدہ'' میں نذیر بنارسی کے ذریعہ جن جن شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں ۱۸۵۷ کے شہیدوں کے علاوہ دیگر نام بھی ہیں جو کہ اہمیت کے حامل ہیں، اس کے علاوہ یہ مضمون اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اتنے سارے تاریخی ناموں کو یکجا کرنے کی مثال اردو میں کم شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔

ڈاکٹر معین افروز۔ حیدرآباد

غزل

چاک پر رکھے ہوئے لفظ کو آکار ملے
شعر کو آج تیرے درد کا اپکار ملے
کس سے کرتا میں تیرے ظلم کی فریاد یہاں
لوگ جتنے بھی ملے تیرے طرفدار ملے
آگ تو لوگ کہیں پر بھی لگادیتے ہیں
برف کی سیج پہ جلتے ہوئے گھر بار ملے
کون کرتا ہے میاں دار پہ حق کی باتیں
سچ تو بس یہ ہے کہ منصور سے دوچار ملے
درد آواز نہ دے زخم نہ چیخے کوئی
غم کی مٹی کو بھی خاموشی کا اظہار ملے

حکیم وسیم احمد اعظمی۔لکھنؤ

اقبال اور دبستانِ شبلی: ایک مطالعہ

علامہ شیخ محمد اقبال (9نومبر1877ء---21اپریل 1938ء) اور علامہ شبلی نعمانی (4جون 1857ء ---18نومبر1914ء) کی عمر میں بیس سال سے زیادہ کا تفاوت تھا،لیکن دونوں ایک دوسرے کی علمی سرگرمیوں سے واقف اور ایک دوسرے کے قدرداں اور مداح تھے۔شبلی شناس جانتے ہیں کہ علامہ اقبال کی پہلی کتاب 'علم الاقتصاد' کی زبان و بیان کی اصلاح علامہ شبلی نعمانی نے کی تھی،انہیں1911ء کی ایک کانفرنس میں 'ترجمانِ حقیقت' کا خطاب شبلی نے ہی دیا تھااور شبلی ہی وہ پہلے اقبال شناس تھے،جنہوں نے اُن کے ایک بڑے شاعر ہونے کی پیش قیاسی کی تھی اور بتایا تھا کہ آزاد اور حالی کی خالی ہونے والی کرسیاں بھرنے والے یہی اقبال ہوں گے اور ان کا موازنہ غالب سے کیا جائے گا۔شبلی کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی اور مردم سازی کے وصف سے متصف کیا تھا۔وہ طبعاً خردنواز تھے،ان کی زندگی کا مقصد یقیناً مردم سازی ہی تھا۔علامہ اقبال اُن کی شخصیت اور اُن کے علم وفضل سے بے حد متاثر تھے۔

ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنی اِس کتاب 'اقبال اور دبستانِ شبلی' میں دبستانِ شبلی سے اقبال کے تعلق کو اپنی تلاش وتحقیق کا موضوع بنایا ہے اور مختلف عناوین کے تحت اپنی تحقیق کو متحقق کیا ہے۔مشمولات کی فہرست درج ذیل ہے:

1۔مقدمہ 2۔اقبال اور دبستانِ شبلی 3۔اقبال اور شبلی 4۔اقبال اور دارالمصنفین 5۔اقبال اور سید سلیمان ندوی 6۔اقبال بنام سید سلیمان ندوی 7۔اقبال اور اقبال سہیل 8۔اقبال اور مولانا عبد الماجد دریا بادی 9۔اقبال اور شاہ معین الدین احمد ندوی 10۔اقبال اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن 11۔اقبال اور یحییٰ اعظمی 12۔اقبال اور ماہ نامہ معارف 13۔کتابیات

علامہ اقبال کی شبلی نعمانی سے شیفتگی اور اُن کی وفات کے بعد دارالمصنفین،معارف اور دبستانِ شبلی سے ان کا علمی،فکری اور تہذیبی ربط وتعلق علم وادب کا ایک روشن باب ہے۔دبستانِ شبلی کے پروردہ افراد بھی اقبال کی عظمت کے اعتراف میں پیش پیش رہے۔شبلی نعمانی کے اوّلین جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی شبلی کی روایت کو قائم رکھا اور علامہ اقبال سے اُخوت،مودت اور محبت کا معاملہ رکھا اور اُن کی وفات پر خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبو کر ان کا ایسا پُرسوز اور جاں گداز مرثیہ لکھا کہ رثائی ادب کی تاریخ میں اس ایسی نظیر شاذ ہی ملتی ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے اعترافِ اقبال کے ہر لمحے کو یادگار بنا دیا تھا۔خود علامہ اقبال نے بھی شبلی کے ہر آثار کو حرزِ جاں بنایا اور ان کے اوّلین جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کو بے حد عزیز رکھا۔ان دونوں دانشوروں کے ربط وتعلق کو معارف کے صفحات اور ان کے خطوط کے تناظر میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔شبلی کے ایک اور لائق شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے 'اقبال کامل' لکھ کر دبستانِ شبلی کی اس روایت کو قائم رکھا،بعد کے ادوار میں شاہ معین الدین ندوی،اقبال سہیل،سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنفین سے وابستہ یحییٰ اعظمی اور مستفیدینِ شبلی میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ربط وتعلق کی اس روایت کو مزید استحکام بخشا۔علامہ اقبال اور شبلی میں کچھ رشتہ ہی ایسا تھا کہ ہر صاحبِ نظر پر واضح ہو جاتا تھا،سید افتخار حسین شاہ نے اپنی کتاب 'اقبال اور پیروئ شبلی' میں بالکل سچ لکھا ہے:

''میں شبلیات اور اقبالیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اقبال اپنی زندگی اور نظریات کے اعتبار سے مجموعی صورت میں اردو و فارسی کے اپنے پیش رو شاعروں اور نثر نگاروں

میں سب سے زیادہ جس کے قریب نظر آتے ہیں وہ مولانا شبلی ہیں''۔ (اقبال اور پیرویٔ شبلی،ص 11-10)

دبستانِ شبلی کے پروردہ افراد نے شبلی سے ذہنی اور فکری قربت رکھنے والے اس اقبال کو اپنی پلکوں پر سجا کر اور اپنی آنکھوں میں بسا کر اس تعلق کے اظہار میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے 'تلاشِ شبلی' کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے، انہوں نے شبلی کے حوالہ سے یافت، باز یافت اور دریافت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'اقبال اور دبستانِ شبلی' بھی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری کڑی ہے۔ اس میں شامل مضامین کے مطالعے سے مصنف کے تحقیقی مزاج، فکرِ صالح اور دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے ۔ اُنہوں نے اس موضوع کو ایک نئی بلندی عطا کی ہے اور فکر و نظر کے بہت سے نئے دریچے کھولے ہیں، جس سے اِس نہج سے اور اس منہج پر بہت کچھ کیے جانے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، جن کو برتنے سے دبستانِ شبلی کے دائرۂ کار اور دائرۂ اثر، دونوں میں مزید وسعت، تازگی، حرارت اور توانائی آئے گی۔

مقدمہ اور راس الکتاب مضمون 'اقبال اور دبستانِ شبلی' کے حوالے سے یہاں ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ کتاب کا دوسرا مضمون 'اقبال اور شبلی' اقبال اور شبلی کے علمی، فکری اور تہذیبی رشتوں پر بیش قدر اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے دورِ طالب علمی میں ہی شبلی نیک نام ہو چکے تھے۔ الفاروق، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، الجزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ وغیرہ کو سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کا اعتبار حاصل ہو چکا تھا۔ ترکی حکومت سے 'تمغۂ مجیدیہ' مل چکا تھا، اقبال بھی شبلی کی تحریروں اور ان کی فکر سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بقول:

''غالباً یہی زمانہ ہے، جس میں اقبال علامہ شبلی سے متاثر ہوئے اور ان کے قریب آئے۔'' (اقبال اور دبستانِ شبلی،ص 13)

شبلی نے سررشتۂ علوم و فنون، حکومتِ حیدر آباد سے وابستگی کے دوران 'سلسلۂ کلامیہ' کا آغاز کیا اور الغزالی، علم الکلام، الکلام اور سوانح مولانا روم جیسی معرکۃ الآرا کلامی کتابیں لکھیں، جو 1902ء سے 1906ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ اقبال اُن دنوں میونخ یونیورسٹی جرمنی سے ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مقالہ میں شبلی کی دو کتابوں الغزالی اور علم الکلام کا حوالہ دے کر شبلی شناسی ثبوت پیش کر دیا تھا اور بقول ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی:

''انگریزی زبان میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب تھی جس میں علامہ شبلی کی کسی کتاب کا حوالہ دیا گیا۔ اس طرح جرمن اہلِ علم کے سامنے شبلی کا نام غالباً سب سے پہلے علامہ اقبال کے ذریعہ پہنچا''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی،ص 14)

علامہ اقبال کا یہ مقالہ " The Development of Metaphysics in Parsia " کے نام سے 1908ء میں لوزک اینڈ کمپنی لندن نے شائع کیا اور اس طرح شبلی کا کلامی اردو ادب انگریزی ادب کا حصّہ بنا۔ بعد کے ادوار میں ادبیاتِ شبلی کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

علامہ اقبال نے کلامی ادب کے ساتھ ہی شبلی نعمانی کی بیشتر کتابوں کا تقابلی اور تجزیاتی مطالعہ کیا تھا، خواہ وہ سابق میں مذکور کتابیں ہوں یا پھر شعر العجم جیسی شاہکار کتاب۔ چنانچہ جب ظہور الدین مہجورؔ نے جب علامہ اقبال سے کشمیر کے شعرائے فارسی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اُنہوں نے شبلی کی شعر العجم کے نہج پر لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اس واقعہ کو اپنے تبصرہ کے ساتھ 'اقبال اور پیرویٔ شبلی' کے حوالہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

''----یہ تذکرہ ضرور لکھئے مگر حروفِ تہجی کے اعتبار سے نہ لکھئے گا، بلکہ شعر العجم کی طرح شعرائے فارسی کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ ہونا چاہئے''۔ یہ اقبال کی زبان سے عظمتِ شبلی کے اعتراف کا ایک نمونہ ہے۔'' (اقبال اور پیرویٔ شبلی،ص 33، سید افتخار حسین شاہ بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی،ص 14)

اقبال اور شبلی کی ملاقات کے واقعہ اور اقبال کے اعزاز میں منعقد تہنیتی اجلاس میں شبلی کی تقریر کو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے عظمتِ رفتہ (ضیاء الدین برنی)، اقبالیات اور قرۃ العین حیدر (عبد الواحب معینی) اور اقبال اور پیروئ شبلی (سید افتخار حسین شاہ) کے حوالے سے اس طرح لکھا ہے:

''اب تک ملّت کے ان دونوں حدی خوانوں میں ملاقات نہیں ہوسکی تھی، چنانچہ صدی کے دوسرے دہے کے آغاز (1911ء) میں جب شبلی کے علم وکمال کا شہرہ نصف النہار پر اور عظمتِ اقبال کے اعتراف کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں دونوں کی پہلی اور شاید آخری ملاقات ہوئی۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی (م:1 جون 1935ء) نے کی تھی۔ علامہ اقبال اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔ ایک مختصر تقریر اور اپنی نظم بلادِ اسلامیہ کا وہ حصّہ جو مدینہ منورہ سے متعلق ہے، پڑھ کر سنایا۔ اسی اجلاس میں علامہ محمد اقبال کانفرنس کی طرف سے 'ترجمانِ حقیقت' کا خطاب دیا گیا۔ اس کانفرنس میں سجاد حیدر یلدرم، جو علی گڑھ میں علامہ کے شاگردرہ چکے تھے، ان کی خواہش پر علامہ شبلی نے علامہ اقبال کو پھولوں کا ہار پہنایا اور ایک مختصر تقریر کی۔ یہی وہ پہلا موقع ہے جب شبلی نے اقبال کو دوسرے غالبؔ ہونے کی بشارت دی تھی''۔

(بحوالہ اقبال اور دبستان شبلی، ص 16)

شبلی کے احوال وآثار کو اپنی تحقیق کا موضوع بنانے والوں نے شبلی کے نام اقبال کا مورخہ 12 جنوری 1912ء کا ایک خط بھی دریافت کیا ہے، جو اب تک کی تحقیق کے مطابق شبلی کے نام اُن کا پہلا اور آخری خط ہے۔ دراصل یہ شبلی کے وقف علی الاولاد سے متعلق ایک خط کا جواب نامہ ہے اور کلیات مکاتیبِ اقبال، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی 1991ء میں شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے یہاں اس کو نقل کرکے اس ربط وتعلق کا احساس کرایا ہے۔

علامہ اقبال شبلی نعمانی کی کتابوں کے شیدائی تھے اور سیرۃ النبی کو اُن کے اعجازِ کمال سے تعبیر کرتے تھے۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے، جس کا صلہ دربارِ نبوی ﷺ سے عطا ہوگا''۔ (مشاہیر کے خطوط، ص 99 بحوالہ اقبال اور دبستان شبلی، ص 20-19)

فکرِ اقبال میں فکرِ شبلی کے اثرات کی تلاش محققین کا ایک پسندیدہ عمل رہا ہے۔ ماہر شبلیات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے بھی اس روایت کا التزام کیا ہے، لیکن اس کے لیے اُنہوں نے ڈاکٹر سید افتخار حسین شاہ جیسا اسلوب نہیں اختیار کیا ہے اور جزرسی سے احتراز کرتے ہوتے اہم مماثلت کو ہی آشکار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی اور اقبال کی شخصیت کی نشو ونما اور تعلیم وتربیت میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے، ذوق ومزاج اور فکر وخیال میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کا مقصدِ حیات ایک اور غور وفکر کا طرز واسلوب بھی ایک تھا اور علامہ اقبال نے انہی قدروں کو ترقی دی، جو دلِ شبلی کی آرزو تھیں۔

اس لئے محققین اور اہلِ قلم نے اقبال اور کو پیروئے شبلی قرار دیا اور بلا شبہ شبلی کے افکار ونظریات کی مکمل عکاسی کلامِ اقبال سے ظاہر ہوتی ہے''۔

(اقبال اور دبستان شبلی، ص 20)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اقبال کی شاعری میں بھی فکرِ شبلی کی اثر پذیری کی نشان دہی کی ہے، لیکن انہوں نے اپنے بیانیے میں سچ اور حق کو ہی جگہ دی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''علامہ اقبال کی شاعری میں فلسفۂ اسلام، کلام وعقائد اور حیاتِ ملّی کے مباحث کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسرارِ خودی اور رموز بے خودی میں بھی یہ مباحث شامل ہیں۔ بالخصوص رموز بے خودی جدید علمِ کلام کی ایک بہترین کتاب ہے۔ اس میں نبوت، توحید، ضرورتِ رسالت، قرآن پر ایمان رکھنے کے اسباب، حاجتِ قبلہ وغیرہ اعتقادی مسائل ومباحث نہایت مؤثر اور دل

نشیں انداز میں بیان ہوئے ہیں۔فلسفہ وکلام کے یہ مباحث اردو میں علمی انداز میں شبلی نے بلند آہنگی سے پیش کرنے کا سلسلہ قائم کیا تھا۔علامہ اقبال نے ان مباحث کو بڑی وسعت و جامعیت کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا مگر شبلی کے تخیل سے اقبال کی پرواز بہت اعلیٰ،ارفع اور بلند ہے،تاہم نقشِ اوّل شبلی ہی قلم کا اعجاز ہے''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی،ص 22)

اردو میں مذہبی اور تاریخی نظموں کا جائزہ ایک بڑا سرور آگیں عمل ہے۔اقبال اور شبلی کی فکریات میں اوّلیت اور مماثلت تلاش کرنے والوں نے اس زاویۂ نظر پر بھی خوب خامہ فرسائی کی ہے۔اس موضوع پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی بھی اپنی ایک رائے ہے۔وہ لکھتے ہیں:

'' اردو میں مذہبی،تاریخی اور واقعاتی نظم گوئی کے آغاز کا افتخار علامہ شبلی کے سر ہے،جس کی علامہ اقبال نے بڑی تحسین وستائش کی ہے اور زور دیا ہے کہ یہ سلسلہ قائم رہنا چاہئے۔دانستہ نہ سہی شبلی کی اس روایت کو خود اقبال نے بڑی ترقی دی۔'' (اقبال اور دبستانِ شبلی،ص24-23)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی مزید لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ شبلی اور اقبال کی یہ سیاسی،حادثاتی اور واقعاتی نظمیں اردو میں ایک نیا تجربہ تھیں۔البتہ ان میں فکری لحاظ سے قدرے فرق واقع ہوا ہے۔

شبلی تڑپتے ہیں،آنسو بہاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس غم میں شریک کر لیتے ہیں اور ان کی شاعری کی پوری فضا غم انگیز بلکہ ماتم زار ہوجاتی ہے۔لیکن اقبال کی حدی خوانی ملّت کے اس غم سے غمگین ہونے کے ساتھ مایوسی کا شکار نہیں ہوتی بلکہ وہ آہوں،آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان ان کا حل اور روشن و تابناک مستقبل کی کرن تلاش کرتے ہیں اور قوم کو حوصلہ شکنی سے بچاتے ہوئے زندگی کی نئی علامتیں پیش کرتے ہیں۔شبلی اور اقبال کے عہد پر اگر نظر رکھی جائے تو دونوں عوامل اپنے اپنے عہد کی غمازی کرتے ہیں۔بہر حال اس میدان میں اقبال کا تاریخی شعور شبلی سے پختہ تر ہوسکتا ہے مگر اوّلیت اور انفرادیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا،یہ افتخار شبلی کے سر ہے''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی،ص 27)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شبلی اور اقبال کے عہد کو دو عہد قرار دیا ہے۔ہمیں شبلی اور اقبال میں فکری لحاظ سے اس فرق کو اس طور پر دیکھا جانا چاہئے کہ اقبال کی انتہائی تعلیم بیرونِ ملک میں ہوئی ہے اور اُنہیں مزاجِ عالم کے سمجھنے کے عملی مواقع زیادہ ملے ہیں۔شبلی کی منتہیات کی تکمیل یہیں،اِسی ملک بلکہ ایک ہی صوبے میں ہوئی ہے اور انہیں دنیا کی سیر کے عملی مواقع بھی نسبتاً بہت کم ملے ہیں مزید اُنہوں نے 'موازنۂ انیس دبیر' لکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر رثائی ادب کے اثرات نزیادہ قبول کیے ہیں،اسی لیے شبلی کی شاعری کی پوری فضا ماتم زار ہوجاتی ہے اور اقبال مایوسیوں کے درمیان تابناک مستقبل کی کرن تلاش کرتے اور زندگی کی نئی علامتیں پیش کرتے ہیں۔شبلی جب تک علی گڑھ اور حیدر آباد میں رہے۔خوب نکھرے اور نیک نام ہوئے،لیکن جب ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوئے اور بعض روایتی مولویوں سے واسطہ پڑا تو اُن کی ساری توانائی الندوہ کے اجراء اور نصابِ تعلیم کی اصلاح اور اس کے نفاذ کی درخواستوں اور گذارشوں میں صرف ہونے لگی۔علی گڑھ میں جسے برسوں پہلے ایڈیٹری کی ذمہ داری دی گئی ہو،وہ ان مولویوں کی نظر میں الندوہ کی ادارت کے قابل یا کم از کم پہلی پسند نہ ہو اور وہ اپنا درد اُن مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے بیاں کر رہا ہو،جو ادارت جیسے بڑے کام کے لیے ان مولویوں کی پہلی پسند ہوں،ایں چہ بوالعجبیست۔مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی نے شبلی کو ان ممکنہ مصائب اور متوقع آلام سے آگاہ بھی کیا تھا۔دار العلوم ندوۃ العلماء،نصابِ تعلیم کے نفاذ اور الندوہ کے اجراء کے حوالے سے شبلی نے اپنے ہم عصروں، بالخصوص مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو جو خطوط لکھے ہیں،اور ان کے نفاذ کی راہ میں اپنی جو توانیاں صرف کی ہیں،وہ حیرت میں ڈال دینے والی ہیں۔کسی مصلحت کے بغیر میں یہ لکھنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ شبلی اگر بروقت ان الجھنوں سے خود کو الگ کر لیتے تو قوم

کے لیے اور بھی معرکۃ الآرا علمی آثار چھوڑ جاتے۔افسوس کی بات ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان جس الندوہ کے اجراء کے لیے شبلی نے مسلسل کئی سال تک اپنے ندوی صاحبوں اور مصاحبوں کے حضور درخواستیں گذارشیں اور بڑی منّت وسماجت کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور اُن کی ادارت میں اگست 1904ء نکل سکا، اسی سے مئی 1912ء میں وہ مستعفی ہوگئے اور پھر دنیا نے دیکھا کہ کچھ دن کے بعد یہ رسالہ آسمان صحافت سے معدوم ہوگیا۔

شبلی نے دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی دیکھا تھا، لیکن مشیتِ خداوندی کچھ اور تھی اور ندوہ سے علاحدگی کے بعد وہ اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لائے اور شہر میں اپنی آبائی حویلی، باغات اور آراضی کے ساتھ ہی اپنے اعزا کی زمینوں پر دارالمصنفین کے قیام کا منصوبہ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس ارادے شرف قبولیت سے نوازا اور آج دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا شمار ایشیاء کے عظیم اسلامی اداروں میں ہوتا ہے اور الندوۃ کی ادارت سے علاحدگی کے بعد اُنہوں نے جس 'معارف' کے اجراء کے خطوط متعین کئے تھے وہ جولائی 1916ء سے کسی التواء کے بغیر انہیں خطوط پر مسلسل عامل اور جاری ہے۔شبلی کو ندوۃ العلماء سے اپنی وابستگی کے خسارے اور اپنی توانائی کے ضیاع کا احساس تھا، جس کا اظہار انہوں نے اپنے احباب سے بھی کیا ہے۔

ہم بات کررہے تھے اقبال کی شاعری پر شبلی کی فکریات کی اثر پذیری کی، اُن کی تعلیم، ماحول اور معاشرت کی اور بات پہنچی گئی قیام دارالمصنفین اور اس کے ترجمان معارف تک۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے صحیح لکھا ہے:

''--- تقسیم ہند کے وقت دونوں (شبلی اور اقبال) موجود نہیں تھے۔تاہم تقسیم ہند کے بعد غالباً مسلم لیگ کی شدید مخالفت کی بنا پر (پاکستان میں) شبلی کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے، البتہ علامہ اقبال پاکستان کے قومی شاعر تسلیم کئے گئے اور ان کے افکار وخیالات کے مطالعہ پر اس قدر توجہ دی گئی کہ اقبالیات کا ایک بڑا ذخیرہ تیار ہوگیا۔اس کے برعکس شبلی پر حکومتِ ہند نے بھی کبھی نگاہ غلط انداز نہیں ڈالی اور جس طرح وہ اپنی زندگی میں مظلوم رہے اسی طرح بعد از مرگ بھی مظلوم ہیں''۔ (اقبال اور دبستان شبلی، ص 31)

کتاب کا تیسرا مضمون 'اقبال اور دارالمصنفین' دراصل ان ہر دو کے ربط وتعلق کا اظہاریہ ہے۔اقبال کو شبلی، آثارِ شبلی اور متعلقاتِ شبلی سے بڑی شیفتگی تھی دارالمصنفین اور اس کے ترجمان معارف کو وہ بے حد عزیز رکھتے تھے اور دونوں کی بقاء اور ارتقاء کے لیے مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی تحریر کرتے ہیں:

'' وہ دارالمصنفین کی پہلی مجلس انتظامیہ کے رُکن نامزد ہوئے اور پھر تاحیات اس پر فائز رہے۔اُنہوں نے متعدد ایسے مشورے دیئے، جن سے دارالمصنفین کے وقار میں اضافہ ہوا مثلاً تاریخ فقہ اسلامی اور حکمائے اسلام جیسی اہم کتابیں اُنہیں کے مشورہ سے دارالمصنفین میں لکھی اور شائع کی گئیں۔'' (اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 34)

دارالمصنفین کے رسالہ ماہ نامہ معارف کے بارے میں علامہ اقبال کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر الیاس الاعظمی مزید لکھتے ہیں:

'' ---خاص طور سے مجلس دارالمصنفین کے ماہوار رسالہ معارف سے اُنہیں بڑی دلچسپی تھی اور وہ اس کے مشتاق رہتے تھے۔'' (اقبال اور دبستان شبلی، ص 34)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی تصانیف میں 'دارالمصنفین کی تاریخی خدمات' کو خاص امتیاز حاصل ہے۔اِس ادارہ کے بارے میں وہ جو بھی لکھتے ہیں، اس کی حیثیت سند کی ہوتی ہے۔اس ادارہ کے قیام کے اغراض ومقاصد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کے نزدیک اس کے قیام کا بنیادی مقصد مخالفینِ

اسلام کی ہرزہ سرائیوں کا مدلل اور مسکت جواب، زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت، اہلِ قلم کی تربیت، بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ اور ان کے طبع واشاعت کا سامان کرنا تھا۔اور بلاشبہ دار المصنفین کے اہلِ قلم اور مصنفین نے مختلف اسلامی علوم وفنون پر دو سو سے زائد بلند پایہ علمی وتحقیقی کتابیں لکھ کر اور تصنیف وتالیف کے لئے متعدد افراد کی تربیت کر کے اپنے ہدف کو پورا کیا۔یہی نہیں بہت سے اہلِ قلم اس کے گوشۂ عزلت وعافیت میں پل کر جوان ہوئے اور ملک کے مختلف حصّوں میں علم وادب کے چراغ روشن کئے، جس کی برصغیر کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔''

(اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 33)

کتاب چوتھا مضمون 'اقبال اور سید سلیمان ندوی' ہے۔شبلی کے علمی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ان کے جن شاگردوں اور شیدائیوں نے شب و روز ایک کر دیئے، ان میں مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولوی شبلی متکلم کا شمار السابقون الاوّلین میں ہوتا ہے۔اس کی دوسری قطار میں شاہ معین الدین ندوی، صباح الدین عبدالرحمٰن اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی آتے ہیں۔

اقبال اور سید سلیمان ندوی میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ذاتی ملاقات، وفد میں ساتھ، علمی مراسلت، اور دار المصنفین اور معارف کے بارے میں مشاورت وغیرہ۔اس حوالہ سے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

'' اقبال شناسی میں جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953ء) کا حصّہ بہت اہم ہے۔وہ معاصر اور اُن کے استاذ کے ممدوح تھے۔خط وکتابت کا سلسلہ شبلی کی وفات 1914ء کے بعد قائم ہوا۔دونوں ایک دوسرے کے فضل وکمال کے بھی بڑے معترف ومداح تھے۔ماہنامہ معارف کے شذرات میں سید صاحب نے اقبال کا ذکر اُن کی زندگی ہی میں متعدد بار کیا۔رموزِ بے خودی کا تعارف وتجزیہ سب سے پہلے انہیں کے قلم سے نکلا''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 35)

علامہ اقبال بھی سید سلیمان ندوی کی دانشوری کے معترف اور ان کے بے حد مداح تھے۔وہ سید صاحب کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلیؒ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں، اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہوگا''۔ (مشاہیر کے خطوط، ص98)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اُونچے زینے پر ہیں۔وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں۔ان کا جود علم وفضل کا ایک دریا ہے، جس سے سیکڑوں نہریں نکلتی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں''۔

(اقبال اور سید سلیمان ندوی، ص19، طاہر تونسوی بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی، ص36)

سید صاحب کی سیرتِ عائشہؓ کے بارے میں لکھا کہ:

''سیرتِ عائشہ کے لیے سراسپاس ہوں۔یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں بلکہ سرمۂ سلیمانی ہے۔اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا''۔ (مشاہیر کے خطوط، ص112)

علامہ اقبال ایک دور میں شبلی نعمانی کو لاہور بلانے میں کسی وجہ سے ناکام رہے تھے۔پھر اُنہوں نے سید سلیمان ندوی کی خدمات اورینٹل کالج لاہور کے لیے چاہیں، سید صاحب اسے پسند نہیں فرمایا، اُنہوں نے سید صاحب کو اپنے مکتوب مورخہ 12 نومبر 1916ء میں لکھا:

''اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے اور آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے مفید ثابت کرے''۔

(مشاہیر کے خطوط، ص 96 بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 45)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنے اِس مضمون میں سید سلیمان ندوی کے نام علامہ اقبال کے ستر (70) خطوط بھی شامل کئے ہیں، جو اِن دونوں کے کثیر المقاصد ربط وتعلق کے مظہر ہیں۔

شبلی نعمانی کے دوسرے چہیتے شاگرد اور دبستانِ شبلی کے

ترجمان مولانا عبدالسلام ندوی بھی اقبال شناس اور اُن کے شیدائیوں میں تھے۔ اِس کتاب میں شامل مضمون 'اقبال اور عبد السلام ندوی' اسی حکایت کو بیاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے لفظوں میں:

''آزاد ہندوستان میں اقبال کی حیات اور فکر وفن پر پہلی کتاب 'اقبالِ کامل' انہی کے قلم سے نکلی''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی، ص121)

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کتاب کی تالیف میں تلاش وتحقیق کا ایک معیار پیش کیا ہے، اُس وقت تک کلام اقبال کا مطالعہ ایک خاص نہج اور منہج پر ہی ہوتا تھا، جس میں نقد واحتساب کا تصور بے حد مضمحل تھا۔ مولانا عبد السلام ندوی نے شخصی احترام اور فکری صالحیت کے ساتھ اُس روش کے متوازی ایک راہ نکالی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''چوں کہ کسی نے اُن کی غلطیوں اور خامیوں کو تفصیل سے نہیں دکھایا ہے، اس لئے ہم خود اس ناگوار فرض کو ادا کرتے ہیں''۔

(اقبال کامل، ص 249، بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 124)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے فلسفۂ شاعری اور فلسفیانہ اشعار کی توضیح وتفہیم میں مولانا عبدالسلام ندوی نے یہی انداز اختیار کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ 'اقبالِ کامل' حیاتِ اقبال کے ساتھ فکرِ اقبال کی تفہیم کا خوب صورت ذریعہ بنی اور بلاشبہ مصنف نے اس میں بڑی دیدہ ریزی اور کدوکاوش سے کام لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ 'اقبال کامل' ذخیرۂ اقبالیات میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی، ص125-124)

اقبال سہیل علامہ شبلی عزیز شاگرد، قادرالکلام شاعر اور بوجوہ اُن کی روایتوں کے امین تھے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اس کتاب میں 'اقبال اور اقبال سہیل' کے عنوان سے یہ مضمون لکھ کر احساس دلایا ہے کہ دبستانِ شبلی کے افراد علامہ اقبال سے صرف عقیدت اور محبت کا معاملہ ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ فکریات کے تصادم میں احتساب بھی اسی شدت کا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (1957-1879ء) کے اس نظریہ پر کہ 'قومیں وطن سے بنتی ہیں'، شعری زبان میں سخت دارو گیر کی اور جس میں حفظِ مراتب کا ذرا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اقبال سہیل کو علامہ اقبال کا یہ انداز بے حد ناگوار گذرا اور اُنہوں نے اس کا منظوم جواب لکھا، جس میں قوم ووطن کے نظریہ کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے نقدِ اقبال کو اُنہیں کے لب ولہجہ میں بلکہ اس سے کچھ سوا لوٹایا گیا تھا۔ اقبال سہیل کی یہ نظم جب علامہ اقبال تک پہنچی تو اسے پڑھ کر انہوں نے فرمایا:

''مجھے خوشی ہے کہ میرا جواب دینے والا بھی 'اقبال' ہی ہے''۔

علامہ اقبال اور اقبال سہیل کی یہ نظمیں دینی اور ادبی حلقے میں دہائیوں تک موضوع بحث رہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ان دونوں نظموں کو نقل کر کے ماضی کے مطالعے کو تازہ کر دیا ہے۔

اقبال اور دبستانِ شبلی میں ایک مضمون 'اقبال اور مولانا عبد الماجد دریابادی' بھی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی 'دبستانِ شبلی' میں کیوں شمار کیے گئے؟ خود اُنہی کے لفظوں میں ملاحظہ کریں:

''اِس سطور کے بے علم راقم کو اردو لکھنا پڑھنا تھوڑا بہت جو کچھ بھی آیا وہ بڑی اور بہت بڑی حد تک فیض انہیں حضرتِ شبلی کا ہے۔ فیض الندوہ کے ایڈیٹر کا، موازنہ اور شعرالعجم کے فن کار کا، اور الفاروق، الکلام، سیرۃ النبی کے مصنف کا، اس ذات کا جس میں بیک وقت ایک شاعر وسخن سنج، ایک مؤرخ ومحقق، ایک مبصر و ناقد، ایک عالم ومعلم، ایک ادیب وانشا پرداز، ایک مصنف واہل قلم کے کمالات تھے''۔ (ادیب، شبلی نمبر، ص7، بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 131)

اسی 'جو کچھ بھی آیا وہ بڑی اور بہت بڑی حد تک' کے اعتراف نے انہیں دبستانِ شبلی کا ایک ممتاز فرد بنانے کا جواز پیدا کیا تھا اور اسی پر بس نہیں، بقول ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی:

''علامہ شبلی کی وفات کے بعد جب دارالمصنفین کی مجلسِ

انتظامیہ کا انتخاب عمل میں آیا تو مولانا دریابادی اس کے رکن نامزد ہوئے، بعدازاں انہیں مجلس انتظامیہ کی صدارت تفویض کی گئی، جس پر وہ آخری سانس تک فائز رہے۔ پھر ماہ نامہ معارف کی مجلسِ ادارت کا انہیں رکن منتخب کیا گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی وفدِ خلافت کے رکن منتخب ہوکر جب انگلینڈ روانہ ہوئے تو معارف کی ادارت کے فرائض انہیں کوسونپ گئے تھے، گویا وہ کلی طور پر دبستانِ شبلی ہی کے فرد رہے اور اسی گہری وابستگی اور ذہنی ہم آہنگی کے سبب انہیں اس کتاب میں بھی شامل کیا گیا ہے''۔ (اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 132-131)

مولانا عبدالماجد دریابادی کو ابتداء میں اقبال سے ذرا بھی عقیدت وموانست نہ تھی بلکہ وہ بھی ان کے مخالفین کے سُر میں سُر ملا کر اُن کی زبان و بیان پر نقد کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ اُن کا یہ عمل کسی نظری مطالعے اور فکری رویے کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ اس کے پس پردہ طفلانہ دانشوری اور اس کی زیریں لہر کے طور پر شوقِ خودنمائی تھا، جس کا ذکر خود اُنہوں نے بھی اقبالیاتِ ماجد میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب سِن اور آیا اور شعر سمجھنے کی تھوڑی بہت تمیز آچلی، وہ بھی زیادہ تر شبلی اور حضرت اکبرالہ آبادی کے فیضِ صحبت سے، تو اپنی اس طفلانہ عادت پر خود بڑی نفریں کی اور اقبال کا کلام بڑے لطف و عقیدت سے پڑھنے لگا''۔ (اقبالیاتِ ماجد، ص 8 بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 132)

بعد کے اَدوار میں علامہ اقبال اور مولانا دریابادی کی لکھنؤ اور حیدرآباد میں ملاقاتیں ہوئیں، خط و کتابت رہی، نظریات اور فکریات کے تبادلے ہوئے اور مولانا دریاباری نے اپنے رسالوں سچ، صدق اور صدق جدید اور ان کے علاوہ دوسرے مجلّات میں فکرِ اقبال کی تفہیم و تشہیر کا فریضہ بھی انجام دیا، اقبال اور اقبالیات پر اس قدر لکھا کہ 'اقبالیاتِ ماجد' 'اقبال شناسی' کا باب الداخلہ قرار پائی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنے اِس مضمون میں اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی اور دبستانِ شبلی کی اِس تثلیثیت کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔

اقبال اور دبستانِ شبلی کے حوالہ سے 'اقبال اور شاہ معین الدین ندوی' بھی ایک جامع اور دخولِ غیر سے مانع مضمون ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی (1974-1903ء) دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نامور فرزند اور مولانا سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ تھے۔ 1924ء میں ندوہ سے فراغت کے بعد بحیثیت رفیق دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور سید صاحب کی پاکستان ہجرت کے بعد 1950ء میں اس کے ناظم مقرر ہوئے اور اپنے تارِ نفس کے ٹوٹنے تک اسی کے ہو رہے۔ ان کے دور میں اقبال کی شخصیت اور فن پر ایک خاص ٹھپّہ لگ چکا تھا۔ اُنہوں نے ماہنامہ معارف کے جنوری — فروری 1950ء کے شمارے میں 'کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا اور اس الزام کی علی رؤس الاشہاد تردید کی تھی۔ اقبالیاتی ادب میں یہ مضمون بے حد اہم تصور کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے 'اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر' کے عنوان سے بھی ایک طویل مضمون لکھا تھا، جو ماہنامہ معارف میں بالاقساط شائع ہوا۔ اس حوالہ سے یہ قابلِ افسوس پہلو یہ ہے کہ شاہ صاحب کے یہ دونوں مضامین گرچہ مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن ہنوز کتابی شکل میں نہیں آسکے۔ دارالمصنفین اور اقبال شناسوں کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔

'اقبال اور دبستانِ شبلی' میں شامل مضمون 'اقبال اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن' بھی اہم ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات (1974ء) کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین کے ناظم منتخب ہوئے۔ یہ بھی سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ اور فکرِ اقبال سے متاثر تھے اور 1933ء میں ایک تعلیمی سفر میں میکلوڈ روڈ، لاہور میں اُن کی کوٹھی پر شرفِ ملاقات حاصل کرچکے تھے۔ جس کا ذکر وہ بڑی سرشاری سے کیا کرتے تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور دبستانِ شبلی والے علامہ اقبال کو کس نظر اور نظریے سے دیکھتے تھے۔ اس بارے میں سید صباح

الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''ہم دارالمصنفین والے علامہ محمد اقبال کو فکرِ اسلام، اسرارِ الٰہی کا محرمِ راز، شریعت کا آشنا، کاروانِ ملّت کا حدی خواں اور فلسفۂ اسلام کا ترجمان سمجھتے تھے، اگر کوئی ان کے نہاں خانۂ زندگی میں جھانک کر ان کو مجروح کرنا چاہتا ہے تو ہم میں ویسا ہی اشتعال پیدا ہوتا ہے جیسے ہمارے کسی مذہبی پیشوا پر حملہ آور ہو کر کوئی اُن کی توہین کرے۔ مجلس کے دیگر رفقاء نے اپنی معروضیت پسندی کی وجہ سے ہماری اس رائے کو انتہا پسندی پر محمول کیا مگر ہم اپنی رائے میں تبدیلی کرنے تیار نہیں ہوئے۔''

(معارف، شذرات، دسمبر 1983ء)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اسی تناظر میں لکھتے ہیں:

''یہی ماحول تھا جس میں سید صباح الدین صاحب و دیگر رفقاء کے ذہن و مزاج میں ذکرِ اقبال، فکرِ اقبال، فلسفۂ اقبال اور ان کے شاعرانہ کمالات کی صدآفریں صدائیں بلند رہیں اور وہ اس کی روشنی سے معمور رہے۔'' (اقبال اور دبستان شبلی، ص 159)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ان نظموں اور ثائی کلام کو اپنے مضمون نقل کر کے شبلی شناسی کی تجدید کے سامان فراہم کئے ہیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اقبالیاتی ادب میں بیش قدر اضافے کئے ہیں۔ ان کے مقالہ 'موجودہ ہندوستان میں اقبال' کی علمی ادبی خوب پذیرائی ہوئی اور اقبال سے متعلق متعدد کتابوں پر اُن کے دیباچے، تقدمے اور تعارف و تبصرے بھی پسند کئے گئے۔

اقبال اور دبستانِ شبلی کے حوالہ سے ایک نام یحییٰ اعظمی (1906-1972ء) کا بھی ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''دبستانِ شبلی کے ممتاز اور منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ اقبال سہیل سے اصلاحِ سخن لی اور مدۃ العمر دادِ سخن دی۔

(اقبال اور دبستان شبلی، ص 164)

یحییٰ اعظمی کو علامہ اقبال اُنس و شیفتگی تھی، وہ ان کے افکار و نظریات سے بے حد متاثر تھے۔ کلامِ اقبال پر اُن کی گہری نظر تھی اور لسانی توقیت میں اس کو استشہاد کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اقبال کی وفات سے اُنہیں سارا ہندوستان اُداس اور سُونا نظر آتا تھا۔ وہ اپنے ایک خط میں ابوعلی اثری کو اقبال پر اُن کے مضمون کی اشاعت پر لکھتے ہیں:

'' آپ کی تحریر کے بعض حصّوں سے بے حد متاثر ہوا، خصوصاً اقبال صاحب مرحوم کی عقیدت کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو کہ وہ مجھے نہ یاد آئے ہوں، مجھے تو اب سارا ہندوستان سونا نظر آتا ہے''۔

(گاہے گاہے باز خواں، ص 65، بحوالہ اقبال اور دبستانِ شبلی، ص 165)

یحییٰ اعظمی نے اپنے شعری مجموعہ 'نوائے حیات' میں علامہ اقبال پر پانچ منظومات ومراثی، ماتمِ اقبال، آہ! اقبال، غمِ اقبال، خطاب بہ شاعرِ حکیم ہند اور شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیاتِ ملّی لکھ کر اُن سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے۔

دبستانِ شبلی اور دارالمصنفین کے ترجمان ماہنامہ معارف نے اقبال اور تفہیمِ اقبال میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ معارف سے اقبال کے ربط و تعلق کا ذکر سابق میں آچکا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے 'اقبال اور دبستانِ شبلی' میں شامل اپنے آخری مضمون 'اقبال اور ماہنامہ معارف' میں تلاش و تحقیق کا ایک منہج اور معیار متعین کیا ہے۔ اُنہوں نے معارف میں اقبال، آثارِ اقبال اور متعلقاتِ اقبال پر شائع ہونے والی جملہ تحریروں کو چھ مختلف زمروں میں تقسیم کر کے ایک مفید اشاریہ مرتب کیا ہے، جو علمی و فکری تغذیہ بھی فراہم کرتا ہے اور تلاش و تحقیق سلیقہ بھی سکھاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''معارف کی اقبال شناسی کے درج ذیل پہلو ہیں:

1۔ کلامِ اقبال کی اشاعت 2۔ مکتوباتِ اقبال کی اشاعت 3۔ تجاویز اور مشورے 4۔ تصانیفِ اقبال اور فکرِ اقبال

پر مضامین و مقالات کی اشاعت 5۔اقبالیات پر پر لکھی جانے والی کتابوں کا مطالعہ و تجزیہ 6۔منظوم خراجِ عقیدت اوّل الذکر عنوان کے تحت اقبال کے ان شعری کلام کی نشان دہی کی گئی ہے، جن کو خود علامہ اقبال نے اوّلاً ماہنامہ معارف کے لیے ہی برائے اشاعت بھیجے تھے۔ان کا پہلا کلام 'ترانۂ اقبال' کے عنوان سے جون 1918ء میں معارف میں طبع ہوا، جو دو اشعار کے اضافہ کے ساتھ بعد میں 'بانگِ درا' میں 'میں اور تو' کے نام سے شامل ہوا۔اقبال کا دوسرا کلام معارف کے اکتوبر 1919ء کے شمارہ میں 'پولیٹیکل گداگری' کے نام سے شائع ہوا، جس کو نام بدل کر بانگِ درا میں 'دریوزہ خلافت' کے نام سے شامل کیا گیا۔اسی طرح اگست 1923ء کے شمارے میں ایک کلام 'نغمۂ ساربان حجاز' اور فروری 1924ء کے شمارے میں 'خلافت اور ترک و عرب' کے عنوان سے ایک تضمین شائع ہوئی۔اس طرح ان چاروں کی اوّلین اشاعت کا شرف ماہنامہ معارف کو حاصل ہوا۔

علامہ اقبال نے دارالمصنفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر کو ستر (70) خطوط لکھے، جو شبلی، دبستانِ شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اور معارف سے ان کے ربط و تعلق مظہر ہیں۔اسی طرح معارف نے اپنے شذرات میں اقبال شناسی کی ذہن سازی کی اور مطالعۂ اقبال کے مزاج کی تکوین میں نمایاں کردار ادا کیا اور تصانیفِ اقبال اور فکرِ اقبال پر ایک سو ساٹھ سے زائد مضامین اور مقالات شائع کر کے اقبالیاتی ادب کی سمت اور رفتار متعین کی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا یہ اعتراف مبنی برحقیقت ہے:

''---معارف کے مذکورہ مقالات کے جس قدر اثرات اقبال شناسی پر مرتب ہوئے وہ شاید ہی دنیائے ادب اردو کے کسی اور رسالے کے حصّے میں آئے ہوں''۔

(اقبال اور دبستان شبلی، ص 192)

اقبال شناسی کے دورِ آغاز سے اب تک اقبال کے احوال و آثار اور فکر و نظر پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں یا مجلّات کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں، ان کے جائزے اور نقد و تبصرے کے لیے بھی معارف کے صفحات مختص رہے ہیں اور یہ اقبال شناسی کی ایک نئی تعبیر رقم کرتے ہیں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنے مضمون میں اس زمرہ کی چورانوے تحریروں کی تفصیلات نقل کی ہیں۔

علامہ اقبال کی وفات (21 اپریل 1938ء) انسانی اور علمی دنیا کا ایک بڑا سانحہ رہی ہے۔چناں چہ اُن کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے ایک سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں بھی ماہنامہ معارف کی اقبال شناسی اور معارف پروری سب پر مقدم تھی۔اس میں اقبال کی شخصیت اور فن پر متعدد شعراء کی نظمیں شائع ہوئیں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے مہ وسال کی تفصیلات کے ساتھ ان کی تعداد بارہ شمار کی ہے۔

'اقبال اور دبستانِ شبلی' کے آخری پیرا گراف میں اختتامیہ کے انداز میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

''دبستانِ شبلی کے اہلِ قلم نے فکر و نظر کی ہم آہنگی کے سبب اقبال کو ہمیشہ اپنا خیال کیا اور بانی دارالمصنفین سے نظریاتی ہم آہنگی کی وجہ سے علامہ اقبال اُن کے محبوب رہے۔اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو علامہ اقبال دبستان شبلی ہی کے ایک فرد معلوم ہوتے ہیں۔شیخ محمد اکرم نے علامہ شبلی کو سرسید تحریک کے ردِعمل کا نتیجہ قرار دیا تھا۔

اگر یہ سچ ہے تو اقبال اس ردِعمل کا اصل نتیجہ قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں''۔ (اقبال اور دبستان شبلی، ص 197)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی یہ کتاب تیس (30) معتبر اور مستند کتابوں اور متعدد مجلّات سے کا اختصاریہ ہے، جس میں ڈاکٹر اعظمی کے خونِ جگر کی حرارت، دقتِ نظر اور فہم و فراست کو بھی بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ 200 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اُتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے 2015ء میں شائع ہوئی ہے اور اقبالیاتی ادب کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔

اسریٰ تسنیم۔ایم فل یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد کی چند مشہور خواتین شعراء

برسوں پہلے خواتین کو تعلیم سے دور رکھ کر روایتوں پر انحصار سلوک روا رکھا جاتا تھا، اب خواتین کے توقیر کا زمانہ ہے، معیار زندگی میں برابر کی شریک سمجھا جاتا ہے، اعلیٰ تعلیم کے لیے تمام در کھول دینے ضروری سمجھا ہے۔ سرزمین دکن ابتداء ہی سے خوشبوؤں کی مہک سے سرشار ہے، علوم وفنون سے آراستہ یہاں کی خواتین کو یہ اعزاز رہا ہے کہ وہ برابر مردوں کے شانہ بہ شانہ چلتی آرہی ہیں۔ اردو ادب سے والہانہ لگاؤ ان کے شعری ادبی خدمات کو بلندیوں پر پہنچایا۔

لطف النساء امتیاز

تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقا چندا بائی نہیں بلکہ لطف امتیاز ہیں، جنہوں نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اس دیوان میں قریباً تمام اصناف غزلیات، قصائد مخمس، مسدس، رباعی، قطعہ، مثنوی اور مناقب ملتے ہیں۔ امتیاز نے اپنی ایک مثنوی میں جنہوں نے اپنے شوہر میر امد علی خان تمنا کے انتقال پر لکھی گئی تھی، اس میں جدائی غم کو انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی ۲۰۳/اشعار پر مشتمل ہے ؎

مہتاب کے آ کے محفل میں ہو جلوہ گر
ترے بن تو ویراں ہے دل کا شہر

مہ لقا چندا بائی

صاحب دیوان شاعرہ تھیں دیوان مرتب کیا تھا، بڑی باغ و بہار شخصیت تھیں۔ شگفتہ طبیعت اور حاضر جوابی میں یکتا تھیں، ان کے کلام میں آمد ہی آمد ہے۔ مہ لقا چندا بائی کو حضرت علیؓ سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے اپنی ۱۱۹/غزلیات کے مقطعوں میں حضرت علیؓ سے دین و دنیا سے آسودگی کی التجا کی ہے۔ اپنی شاعری میں تصوف اخلاق اور نصیحت آمیز مضامین بھی شامل ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جذبات کے ساتھ ساتھ گہرائی و گیرائی بھی ہے ؎

کچھ کچھ نظر جو آتی ہے سیماب میں تڑپ
سیکھی ہے طرز دل سے میرے اضطرار کی
حاضر ہے ہم بھی گر ہو ارادہ بیاں کا
رکھتا ہو وصف اپنے میں وہ عزوجاہ کا

ڈاکٹر شمع پروین

ڈاکٹر شمع پروین حیدرآباد کی مترنم شاعرہ رہی ہیں، کل ہند مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنا کر داد حاصل کرتی رہیں۔ آپ کی غزلوں کو ساز پر پیش کیا گیا۔ شمع پروین کے کلام میں سادگی وسلاست کے علاوہ نغمگی وشیرینی بھی ہے، رومانی تصورات کے ساتھ عصری آگاہی کا شعور بھی ہے ؎

باد صبا کی طرح وہ آئے تھے خواب میں
پھولوں کو ہم نے چوم لیا تھا جواب میں
جب بے رخی سے پھیر لیں نظریں تو یوں لگا
پانی ملا دیا ہے کسی نے شراب میں

تہنیت النساء بیگم تہنیت

حیدرآباد کی مشہور و معروف نعت گو شاعر تہنیت النساء تہنیت، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی شریک حیات تھیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہی رہا ہے۔ انہوں نے حمد، نعت اور منقبتوں کو ہی ترجیح دی۔ غزل میں طبع آزمائی نہیں کی۔ تین نعتیہ شعری مجموعے ذکر و فکر ۱۹۵۵ء میں صبر و شکر ۱۹۵۶ء اور تسلیم و رضا ۱۹۵۹ء میں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کی۔ خواجہ حسن نظامی نے انہیں طوطی دکن کا خطاب عطا کیا تھا۔ مدینہ منورہ کی حاضری پر تہنیت کے اس شعر نے امجد حیدرآبادی کو بہت متاثر کیا ؎

وقت رخصت ہم پہ جو گزری وہ اب تک یاد ہے
چھوڑتے ہی ان کا در تنہا نظر آنے لگا

شفیق فاطمہ شعری

برصغیر کی مشہور و معروف شاعرہ رہی ہیں۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی شاعری حیدرآباد میں بے حد مشہور و مقبول رہی۔ شفیق فاطمہ کا گھرانہ یعنی ننھیال اور ددھیال ملی جلی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے، جن پر تصوف اور شیعیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد بی اے کیا۔ منظوم تراجیح کے بعد ۱۹۵۱ء سے شاعری شروع کی۔

ممتاز کالج کی لکچرر رہیں، کئی رسائل چھپے، تین مجموعے کلام گلہ صفورا ۱۹۶۵ء میں آفاق نوا ۱۹۸۷ء اور سلسلہ مکالمات بھی شائع ہوئے۔ ایلورہ اجنتا کی نظموں سے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

تیرا نام لے کے سحر جاگتی ہے
تیرے گیت گاتی ہے تاروں کی محفل
تیری خاک پابند کاراز عظمت
تیری زندگی میرے خوابوں کی منزل

صغری عالم

صغری عالم کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں گلبرگہ شریف میں ہوئی، ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ درس و تدریس سے وابستہ رہیں، ادبی و تنقیدی مضامین لکھنے کا بہت شوق رہا۔ شاعری میں دلچسپی ابتداء سے رہی، حسن، خوشبو، درد، کرب اور خوشی و انبساط کو محسوس کرنا اور شاعری میں ڈھالنا مزاج بن گیا۔

آنکھ میں جب درد میرا صورت دل جائے گا
شاخ گریہ پر خوشی کا پھول بھی کھل جائے گا
پھول کی ایک مسکراہٹ میں خدا موجود ہے
درد دل میں صورت وصوت وصدا مل جائے گا
ایک ایک شخص بھی معصوم ہے صغری عالم
آگ شہروں میں لگی کس نے لگائی لکھنا

امتہ الکریم خورشید

امتہ الکریم خورشید، خورشید نذیر کے نام سے مشہور ہوئیں، نوعمری میں ہی شوہر کا انتقال ہوگیا۔ ان کی زندگی غم والم کے طوفان میں گھر گئی، چونکہ بچپن سے شاعری کا ذوق تھا، یہی ان کی زندگی کا سہارا بن گئی، تلخی حیات نے ان کے کلام سوز و گداز پیدا کردیا۔ مشاعروں میں بھی شرکت کرتی رہیں وہ تحت اللفظ میں کلام سنایا کرتی تھیں ؎

دل کو میرے تیری الفت کا سہارا نہ ملا
زندگی جس میں ہو رقصاں وہ اشارہ نہ ملا
غرق دریا تو ہوئے کوئی کنارہ نہ ملا
ڈوبتوں کے لیے تنکے کا سہارا نہ ملا

بشیر النساء بیگم بشیر

بشیر النسا بشیر دکن کی خاتون شعراء میں ممتاز اہمیت کی حامل تھیں۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ نظم طبا طبائی، ابوظفر، عبدالواحد اور صفی سے اصلاح لیتی رہیں۔ ان کا ضخیم شعری مجموعہ ''آبگینہ شعر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوکر مقبول ہوا۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ عہد حاضر کی وہ باکمال خاتون ہیں، جن کا کلام دنیائے ادب میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

میرا ضمیر ہے بے تاب جستجو اس میں
جھلک رہی ہے میرے دل کی آرزو اس میں
بشیر کیا کہوں کیا شئے ہے آبگینہ شعر
میری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں

لئیق فاطمہ شبنم

لئیق فاطمہ شبنم حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں شعر و سخن کی نہایت کامیاب شاعرہ رہی ہیں۔ شبنم کے کلام تجربہ مشاہدہ اور فکر احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ یاسیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی رنگینیاں اور رعنائیاں اجاگر دکھائی دیتی ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنف رہی ہے۔

احمد نور عینی
پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

اقبال فہمی

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

حل مفردات:

ملوکیت: بادشاہت، حاکمیت۔ آثار: نشانیاں، پاگل پن۔ جنوں: پاگل پن۔ نشتر: زخم کھولنے کا اوزار۔

تشریح:

اس شعر میں اقبال نے خدائی نظام کی ایک اہم سنت کا ذکر کیا ہے، وہ سنت یہ ہے کہ خدا ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بسا اوقات ان سے زیادہ طاقتور ظالموں کو ان پر مسلط کر دیتا ہے، خدا نے اپنی اس سنت کو قرآن میں یوں بیان کیا ہے 'وکذلک نولی بعض الظالمین بعضا بما کانو یکسبون' (سورۃ الانعام: ۱۲۹) (اور اسی طرح ظالموں میں سے ایک کو دوسرے پر ہم ان کی شامت اعمال کی وجہ سے مسلط کر دیتے ہیں)۔

شعر کے پہلے مصرع میں ملوکیت کا لفظ ملوک سے مصدر صناعی ہے، ملوک ملک بمعنی بادشاہ کی جمع ہے، ویسے تو اس کے لفظی معنی بادشاہ بننے کے آتے ہیں؛ لیکن یہاں یہ لفظ اس نظام حکومت سے عبارت ہے جس میں حاکم مطلق العنان ہو، اقتدار کے نشہ میں چور ہو، اس کا فرمان ہی دستور ہو، جس کو ماننے پر رعایا مجبور ہو، جس میں حاکم کو نہ دست قانون روک سکے اور نہ زبان خلق ٹوک سکے، جس میں حکمرانی خدائی امانت کے بجائے خاندانی وراثت سمجھی جاتی ہو، واضح رہے کہ یہاں ملوکیت کا لفظ اس محدود اصطلاحی معنی میں نہیں ہے جو جمہوریت کے بالمقابل بولا جاتا ہے؛ کیوں کہ اقبال نے اپنے اس شعر میں تیمور اور چنگیز کو بطور مثال کے پیش کیا ہے، اور چنگیز و تیمور کے دور میں مروجہ جمہوریت غیر متعارف تھی، دوسرے یہ کہ اگر کسی جگہ کی جمہوریت میں بھی آثار جنوں آجائیں تو وہ بھی اللہ کے نشتر کے زد میں آجاتی ہے، ہاں اتنا ہے کہ اصطلاحی ملوکیت عموماً مطلق العنانیت اپنے اندر لیے ہوتی ہے اس لیے آثار جنوں اس میں بہ آسانی پیدا ہو جاتے ہیں۔

جنوں کا لفظ عام طور سے شعرا کے یہاں مثبت معنوں میں استعمال ہوتا ہے، عشق و محبت کی وارفتہ کیفیت کو جنوں سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ لیکن اس مصرع میں جنوں منفی معنوں میں استعمال ہوا ہے، یہاں اس سے مراد پاگل پن، نادانشمندی، ناعاقبت اندیشی، قوت فیصلہ کا فقدان اور فکری بے راہ روی ہے۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ جب اقتدار کی باگ ڈور مطلق العنان اور نا اہل حکمران کے ہاتھ آتی ہے تو وہ پاگل پن کے ایسے مظاہرے کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، خواہ وہ مظاہرے عیاشی کی شکل میں سامنے آئیں یا قتل و غارت گری کی صورت میں؛ مگر ملوکیت کے یہ آثار جنوں جب اپنی انتہا کو پہنچتے ہیں تو خدا کی سنت رو بہ عمل آتی ہے اور خدا کی طرف سے ایک دوسرا طاقتور حاکم طبقہ (خواہ وہ خود ہی ظالم کیوں نہ ہو) اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ تختِ اقتدار سے تختۂ دار تک پہنچتا ہے یا کم از کم اس کا دماغ ٹھکانے لگتا ہے، اور جنوں کے آثار رخصت ہو جاتے ہیں۔

(جاری)

اردو ادب کے دو نامور شخصیات، پدم شری جیلانی بانو اور پروفیسر انور معظم کے ساتھ
شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے اراکین کی ملاقات اور رسم اجرا

بروز یکشنبہ، ۲۶ اگست ۲۰۱۸ کو، اردو ادب کی مشہور فکشن نگار، پدم شری محترمہ جیلانی بانو کے دولت خانہ، ایم ایل لے کالونی، بنجارہ ہلس پر ایک ادبی ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ ٹرسٹ کے چیئر مین، ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی کے علاوہ دیگر اراکین میں ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر عبدالقدوس اور ڈاکٹر سراج احمد انصاری، محترمہ کے دولت خانے پر حاضر ہوئے جہاں ان کے شوہر نامدار پروفیسر انور معظم صاحب موجود تھے جنہوں نے بڑے پرتپاک انداز سے نو آمد افراد کا استقبال کیا۔ رسمی تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو وقت کی قلت پر منقطع ہوا، منقطع ان معنوں میں کہ رخصتی کے وقت انہوں نے 'لامکاں'' (حیدرآباد کی وہ جگہ جہاں اکثر و بیشتر، ادبی اور ثقافتی پروگرام ہوتے رہتے ہیں) پر ایک خاص ادبی مقصد کے ساتھ ملاقات کا وعدہ کیا۔ گفتگو کے دوران آپ نے فرمایا کہ رہتی دنیا تک ادب تخلیق ہوتا رہے گا لیکن آج ضرورت اس بات کی ہے کہ زبان پر دھیان دیا جائے۔ نہ صرف اسکولوں سے بلکہ ہمارے گھروں سے بھی اردو غائب ہو رہی ہے۔ نئی نسل غلط۔ صحیح انگریزی بولنے کی کوشش میں منہمک ہے۔ کالج اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ ادب پڑھا کر اپنی ذمہ داری سے بری و ذمہ ہو جانا چاہتے ہیں۔

محترمہ جیلانی بانو صاحبہ نے بھی اپنے شوہر نامدار کی باتوں کی تائید کی اور فرمایا: ''نئی نسل میں اردو سے دلچسپی ختم ہو رہی ہے۔ ہمیں اس بات کے لیے فکر مند ہونا ہے کہ ان میں دلچسپی کس طرح پیدا کی جائے'' معززین کی دلی خواہش ہے کہ والدین اپنے بچوں کو دیگر تعلیمات کے ساتھ اردو زبان کی بھی تعلیم دیں۔ اس دوران نے انہوں نے ایک Organization ''پرتھم'' کا ذکر کیا جس نے ہندوستان کی متعدد زبانوں کی بنیادی جانکاری عوام تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس ادارے کا مرکزی دفتر حیدرآباد میں ہے اور اس کا اردو سیکشن، پروین سیدہ کی نگرانی میں ترقی کے مراحل طئے کر رہا ہے۔ اس ادارے کے برانچز ہندوستان کے اکثر ریاستوں میں سرگرم عمل ہیں۔

دونوں حضرات کے متعلق کچھ بھی کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہے لیکن زندگی کے تجربات سے حاصل جو فکر اور تخیل ان کے پاس ہے بہت کم لوگوں کا سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ انہوں نے بہت پہلے ایک ایسی ویب سائٹ تیار کی تھی، جہاں اردو کتب، رسائل اور اخبارات کے پرانے نسخے دیکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں۔ صحت نے ساتھ نہیں دیا اور وہ کام ادھورا رہ گیا۔ اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان سے محبت دیکھئے کہ بانو نے بہت پہلے دکنی زبان کی آڈیو رکاڈنگ کی تھی۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے خود لوگوں کی آوازیں رکارڈ کی۔ اس میں سب کی الگ الگ آوازیں ہیں، مثلاً عورت، مرد، سبزی والا، نوکر، خادمہ، اساتذہ، پروفیسر اور ادیب وغیرہ کی غیر رسمی باتیں رکارڈ کی گئی ہیں۔ کچھ لوگ اسے امریکہ اور پاکستان لے گئے۔

پروفیسر انور معظم نے رسالہ ''صدائے شبلی'' کو خوب سراہا اور اسے اور بہتر بنانے کی خاطر نیک مشورات سے نوازہ۔ آخیر میں ان کے معتبر ہاتھوں سے اگست ۲۰۱۸ کے شمارے کے اجرا کی رسم پوری کی گئی۔ ڈاکٹر سراج احمد انصاری کی کتاب ''مضراب نقد'' کو بصد خلوص و احترام انہیں تحفتاً پیش کیا گیا۔ جسے انہوں نے بڑی شفقت و محبت سے قبول کیا۔ اللہ انہیں لازوال صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین۔

فروغ اردو اور دیگر زبانوں میں اردو کے سرمائے کی پیشکشی وقت کی اہم ضرورت

قمرالدین صابری اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ''تحریک آزادی میں اردو کا کردار سمینار کا انعقاد۔ شرکاء کا خطاب

حیدرآباد۔ 2۔ستمبر۔راست۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو زبان اور اس سے وابستہ ادیبوں، شعرا اور صحافیوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اردو ہی وہ واحد زبان تھی جس نے تحریک آزادی کی روح کو ابتداء سے آخر تک غذا پہونچائی۔ اس وقت کے شعرا نے اپنی جذباتی شاعری سے، صحافیوں نے اپنے زور قلم سے اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات سے اور قائدین نے اردو زبان کی بے مثال اظہار قوت سے تحریک آزادی مین جان ڈالی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف تحریک آزادی میں اردو کے کردار کی بلکہ ہمارے اردو ادب کے گراں قدر سرمایے کو دیگر ابنائے وطن تک دیگر زبانوں میں اور خود ہماری نئی نسل کو اردو زبان میں اس کی اہمیت سے واقف کرانا اور اس عظیم سرمائے کو ان تک منتقل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تا کہ اردو کے شاندار ماضی کا احیاء ہو اور اردو زبان وادب اپنے تعمیری کردار کو برقرار رکھے۔ ان خیالات کا اظہار مختلف دانشوروں نے قمرالدین صابری اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شاداب ہال میں منعقدہ ایک روزہ قومی اردو سمینار ''تحریک آزادی میں اردو کا کردار'' عنوان سے خطاب کے دوران کیا۔ اس سمینار کے صدارت پروفیسر عقیل ہاشمی سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ مہمانان خصوصی میں ڈاکٹر مسعود جعفری نامور مورخ، پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور جناب اسلم فرشوری تھے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے نظامت کے فرائض انجام دئے اور جدوجہد آزادی میں اردو شعرا کا کردار کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا اور اس امید کا اظہار کیا کہ ابھی مکمل آزادی کے ثمرات ملنا باقی ہیں اور ہمارے شعر وادب کو زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنی چاہئے۔ ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی مدیر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد اور صدر شبلی انٹرنیشنل ٹرسٹ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہماری جدوجہد آزادی کی تحریک علمائے کرام کی عظیم قربانیوں اور اردو شعر وادب کے مثالی کردار سے معمور ہے۔ جس کی یاد اور مستقبل میں اس سے روشنی حاصل کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ نظام آباد سے ذریعے فون اس موضوع پر خطاب کرتے ہوئے نامور محقق جناب وسیم احمد نے کہا کہ ہمارے قائدین نے حصول آزادی کی خاطر جیل کی صعوبتیں برداشت کیں اور جیل میں رہ کر اردو میں آزادی کے جذبے کو پروان چڑھایا انہوں نے کہا کہ جان نثار اختر نے ''ہندوستان ہمارا'' کے نام سے جد وجہد آزادی میں اردو کی قومی شاعری کا جو انتخاب دو جلدوں میں مرتب کیا ہے اسے دوسری زبانوں میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اردو میں سمینار اور جلسے تو کرتے ہیں لیکن ہماری بات دیگر ابنائے وطن تک نہیں پہونچتی اس کے لیے انہوں نے اردو محققین پر زور دیا کہ وہ ہمارے ادب اور ہمارے افکار کو دیگر زبانوں میں ابنائے وطن تک پیش کریں۔ نامور شاعر ادیب اور مورخ ڈاکٹر مسعود جعفری نے بہ طور مہمان خصوصی اس سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آزادی ایک جذبے کا نام ہے جسے ہمارے قائدین، عوام، ادیبوں اور شعراء نے پروان چڑھایا اور اردو زبان نے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا انہوں نے مثالیں دیتے ہوئے کہا کہ انقلاب زندہ باد جیسا نعرہ اور ترک موالات جیسی اصطلاحات اردو نے ہی دی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے سبھی قائدین اردو میں بات کرتے تھے اور کسی اور زبان میں تحریک آزادی نہیں چلی۔ انہوں نے اقبال۔ حسرت۔ چکبست۔ جوش اور دیگر شعرا کے کلام سے اشعار سناتے ہوئے کہا کہ ہمارا شعری سرمایہ تحریک آزادی کے لٹریچر سے بھرا پڑا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں انگریزوں سے تو غلامی سے نجات ملی ہے لیکن ابھی بھی تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں حقیقی آزادی کا انتظار ہے جس کے لیے اردو اور اہل اردو کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب اسلم فرشوری نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے گھروں میں عملی طور پر اردو کے چراغ کو روشن رکھیں اور اپنے بچوں کو اردو سکھائیں اس کے لیے انہوں نے بیرون ملک اپنے خاندان کے بچوں کو عملی طور پر اردو سکھانے کے اقدامات بیان کئے۔ انہوں نے کہا کہ سوشل میڈیا کی طاقت کو اردو کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے۔ ڈاکٹر مجید بیدار صاحب سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ یہ اچھی تجویز ہے کہ تحریک آزادی اور اردو سے وابستہ اردو کے سرمایے کو دیگر زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ابوالکلام آزاد ہوں یا دیگر قائدین ان کے بارے میں انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں مواد نہیں ملتا۔ جس کی جانب

اللہ جسے جو چاہتا ہے نواز دیتا ہے، حیدرآباد کو ناز ہے، ہزاروں حافظوں میں) حافظ وقاری عبداللہ عبدالمتین عثمانی، (حیدرآباد) نے پہلی پوزیشن حاصل کی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر محمد گوہر اور مولانا ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی کی خصوصی مبارکباد

حیدرآباد پریس نوٹ/ڈاکٹر مختار احمد فردین تجزیہ نگار گھر تہذیب اور انسانیت کی یونیورسٹی کہلاتی ہے اور ہے اور ماحول کو اپناتا ہے اور سماج کا ایک اہم حصہ ایک عظیم کارنامہ انجام دینے والا طالبعلم بارہویں حافظوں کیلئے مقابلہ قرأت میں اول پوزیشن حاصل پوری اسلامی دنیا کیلئے اس خاص موقع پر ڈاکٹر مختار کا کہنا ہے کہ جس گھر میں تعلیم اور نیک ماں ہو، وہ انسان تمام اچھائیوں کے ساتھ ماحول میں ڈھلتا بن جاتا ہے جسکی بڑی مثال آج اسلامی دنیا میں جماعت کے حیدرآباد، حال مقیم جدہ نے ہزاروں کر کے ملک ہندوستان والدین اور قوم کا سر بلند کیا احمد فردین، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر محمد گوہر ایڈیٹر تاثیر نے والدین عبداللہ عبدالمتین اور خصوصی مبارکباد عبدالمتین کو دیتے ہوئے نیک خواہشات اور اعلی ترین کامیابی کیلئے دعاء کی

توجہ کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اردو کے نئے محققین اور اسکالرس کو اس جانب توجہ پر زور دیا۔ جناب محمد ایم انور صاحب سرپرست قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن نے کہا کہ آزادی کی جدوجہد جاری ہے۔ ماضی میں تو اردو نے حصول آزادی کے لیے بہت کام کیا اب اس سلسلے کو آگے بڑھانا ہے اور قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن کے ماہانہ اجلاسوں کے انعقاد کا مرکز یہی ہے کہ اردو کے شاندار سرمایے سے استفادہ ہو اور نئی نسل تک اردو کے ورثہ منتقل ہو۔ انہوں نے نچلی سطح پر اردو کی تعلیم کو عام کرنے محبان اردو سے عملی اقدامات کی اپیل کی اور اعلان کیا کہ نئے تعمیر شدہ شاداب ہال میں ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے عالمی سطح کے اردو دانشوروں کے براہ راست خطابات رکھے جائیں گے جس کے لیے تکنیکی مدد ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کر رہے ہیں اور آج انہوں نے نظام آباد سے ذریعے فون نامور اسکالر وسیم احمد کی علمی گفتگو سمینار میں کرائی۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کا سمینار ہر لحاظ سے کامیاب رہا کہ اس میں تحریک آزادی کی تاریخ کے اہم گوشے سامنے آئے اور حصول آزادی میں اردو شعر و ادب کے شاندار کردار کا اعادہ کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اب ہمیں عملی اقدامات کرنے ہیں اردو کو نئی نسل تک پہونچانا ہے۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ ہم اپنے بچوں سے اردو میں گفتگو کریں اور دن کے کسی ایک وقفے میں ان سے اردو کے حوالے سے گفتگو کریں۔ کتابیں تو بہت ہیں لیکن اب جدید وسائل استعمال کرتے ہوئے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو نئی نسل تک منتقل کیا جائے۔ انہوں نے قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن کو کامیاب پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد دی اور کہا کہ وہ فروغ اردو کے اس طرح کے پروگراموں میں ہر لحاظ سے ساتھ دیں گے۔ اس سمینار کے اختتام پر نامور شاعر جناب مومن خاں شوق کے شعری مجموعے ''متاع سخن'' کی اشاعت کے موقع پر انہوں تہنیت پیش کی گئی اور گلپوشی کی گئی۔ پروفیسر محمد عبدالرحمٰن صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

محمد مظہر محی الدین مظہر

مغل پورہ، حیدرآباد

غزل

موجود ذرے ذرے میں، ہے وہ کدھر نہیں
آنکھوں میں خود ہماری شعورِ نظر نہیں
کیا آہ لب پہ دل میں تڑپ آنکھ تر نہیں
پھر کس لیے دعا میں ہماری اثر نہیں
قرآن دست برد سے محفوظ کیوں نہ ہو
اللہ کا ہے کلام، کلامِ بشر نہیں
مایوس ہو نہ ذات سے پروردگار کی
نادان تیرے حال سے وہ بے خبر نہیں
باقی کہاں ہے کوئی جگہ غیر کے لیے
دل میں ترے سوائے کسی کا گزر نہیں
کچھ فوقیت کسی کو کسی پر نہیں یہاں
واعظ یہ مئے کدہ ہے خدا کا تو گھر نہیں
مظہر کریں گے ان سے تقاضہ نہ دید کا
منظور اتنی بات بھی ان کو اگر نہیں

رفیعہ تبسم
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

مسجد نبوی کی توسیع اور مختلف ادوار میں اس کی تاریخ

دورِ علی مرتضیٰ

حضرت عثمانؓ تعمیر مسجد کے تھوڑے عرصے بعد شہید کردیئے گئے تو وہ اتنی مضبوط تعمیر کرگئے تھے کہ سردست ردوبدل یا مزید تعمیر کی ضرورت نہ تھی، اس لیے خلیفہ چہارم حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانے میں کوئی توسیع نہ کی گئی۔

چوتھی توسیع اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حکم پر عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۸۸ھ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے شروع کی اور ۹۱ھ میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا مغرب کی طرف بیس ہاتھ اور مشرق کی جانب تقریباً تیس ہاتھ کا اضافہ کیا گیا۔ امہات المومنین کے حجرے بھی مسجد میں شامل کردیئے گئے، شمالی جانب بھی اضافہ کیا گیا۔ تعمیر جدید منقوش پتھر سے کی گئی، ستون کھوکھلے پتھر سے بنائے گئے اور درمیان میں لوہا اور شیشہ ڈالا گیا، دو چھتیں ڈالی گئیں، نچلی چھت ساگوان کی لکڑی سے تیار کی گئی، مسجد نبوی میں مینار سب سے پہلی مرتبہ ولید کی اس توسیع ہی میں بنائے گئے۔ ابن زیالہ وغیرہ کی روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسجد نبوی کی توسیع وتعمیر کی تو چار مینار بھی بنائے، محراب بھی اسی توسیع میں بنایا گیا، مسجد کی دیواروں پر اندرونی جانب سنگ مرمر، سونا اور رنگدار اینٹیں لگائی گئیں، اسی طرح ستونوں کے بالائی حصوں اور دروازوں کی چوکھٹوں اور چھت پر سونے سے ملمع کاری کی گئی نیز مسجد کے بیس دروازے بنائے گئے۔ (دارالسلام۔ انگلش سیرت نبوی، ص: ۱۶۵)

پانچویں توسیع مہدی عباسی کا دور ۱۴۱ھ میں جب خلیفہ مہدی حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ گیا تو جعفر بن سلیمان کو مدینہ منورہ کا گورنر مقرر کیا اور اسے مسجد نبوی کی توسیع کا حکم دیا۔ اس کام میں اس کے ساتھ عبداللہ بن عاصم بن عبدالعزیز اور عبدالملک بن شبیب غسانی کو بھی مقرر کیا، اس دفعہ شمالی جانب اضافہ کیا گیا، مہدی نے مسجد نبوی کے اردگرد کچھ گھر خرید لیے، ان میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا گھر جسے 'دارالملیکہ' کہا جاتا تھا، شرجیل بن حسنہؓ کا گھر اور عبداللہ بن مسعودؓ کا گھر جسے 'دارالقراء' کہا جاتا تھا، مسجد کے احاطے میں شامل کردیئے گئے (دارالسلام۔ انگلش سیرت نبوی، ص ۱۶۵)

۸۸۸ھ میں سلطانی قایتبائی کے زمانے میں چھٹی توسیع

۶۵۶ھ میں عباسی خلافت کے خاتمہ کے بعد مدینہ منورہ کے حکومت مصر کے بادشاہوں کے ہاتھ آگئی اور وہ لوگ مسجد نبوی کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لیتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ توجہ سلطان اشرف قایتبائی نے دی۔ جب ۸۸۶ھ میں رمضان المبارک کی تیرھویں رات مسجد نبوی کی آگ لگ گئی تو سلطان قایتبائی نے مسجد کی عمومی تعمیر شروع کردی۔ اس کی تکمیل ۸۸۸ھ میں رمضان المبارک کے آخر میں ہوئی اس نے مقعدہ والی مشرقی جانب میں سوا دو ہاتھ کا اضافہ کیا نیز مسجد کی چھت ایک کردی، چھت کی بلندی بائیس ہاتھ تھی۔ (تاریخ مدینہ منورہ، ص: ۷۱)

ساتویں توسیع ۱۲۷۷ھ میں خلیفہ عبدالمجید عثمانی کے عہد ۱۲۵۶ھ۔۱۲۷۷ھ میں مقصورہ، منبر شریف، مغربی دیوار، محراب نبوی، محراب سلیمانی، محراب عثمانی اور بڑے مینار سوا ساری مسجد دوبارہ تعمیر کی گئی۔ مسجد کے تمام فرش اور قبلہ والی دیوار کے نقف تک سنگ مرمر لگایا گیا، چھت کے تمام گنبدوں میں نقش نگار بنائے گئے۔ روضہ اطہر کے ستونوں پر سفید اور سرخ سنگ مرمر لگایا گیا تاکہ وہ دوسرے ستونوں سے ممتاز نظر آئیں، اس کام میں تین سال لگے، اس عمارت میں ایک نیا دروازہ 'باب مجیدی' کے نام سے بنایا گیا جو دراصل مسجد کے اندر تھا۔ (مطبوعہ دارالسلام۔ انگلش سیرت نبوی، ص: ۱۶۵۔۱۶۲)

عمانی ترکوں نے تیرھویں صدی ہجری میں مسجد نبوی

میں جو توسیع کروائی اس کی تفصیل حددرجہ ایمان افروز ہے۔ ترکوں نے جب اس کام کا ارادہ کرلیا تو انہوں نے اپنی وسیع وعریض سلطنت میں اعلان کیا کہ انہیں عمارت سازی کے متعلق مختلف علوم وفنون کے ماہرین درکار ہیں۔ اعلان کرنے کی دیر تھی کہ سنگ تراش، معمار، نقشہ نویس، خطاط، رنگ ساز، شیشہ گر کے ماہرین نے اپنی خدمات پیش کیں، ترک حکومت نے اپنے تمام اہلکاروں اور سفیروں کو ہدایت کی کہ ان تمام ماہرین اور ان کے خاندانوں کو سفر کی ہر سہولت پہنچائی جائے، پھر قسطنطنیہ کے باہر ایک شہر بسایا گیا، جس میں اطراف عالم سے آنے والے ان قافلوں کو اتار کر ہر شعبے کے ماہرین کو الگ الگ محلوں میں بسایا گیا۔ اس سارے عمل میں کئی سال لگ گئے۔

اس کے بعد عقیدت اور حیرت کا نیا باب شروع ہوا۔ خلیفہ وقت جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا تھا، خود بسائے گئے شہر میں آیا اور ہر شعبے کے ماہرین کو تاکید کی کہ اپنے ذہین ترین بچے کو اپنا فن سکھائیں اور اس طرح سکھائیں کہ اس فن میں اسے یکتا و بے مثال کردے، اسی اثنا میں ترک حکومت ان بچوں کو قرآن حفظ کروائے گی اور شہسوار بنائے گی۔ دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب وغریب منصوبہ کئی سال جاری رہا۔ پچیس برس بعد نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو نہ صرف اپنے اپنے شعبے میں یکتائے روزگار تھے بلکہ ہر شخص حافظ قرآن باعمل مسلمان تھے، یہ تعداد میں تقریباً پانچ سو تھے، اسی دوران میں ترکوں نے پتھروں کی نئی کانیں دریافت کیں، نئے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹی گئیں، تختے حاصل کیے گئے اور شیشے کا سامان پہنچایا گیا، یہ سارا سامان نبیؐ کے شہر پہنچا تو ادب کا یہ عالم تھا کہ اسے رکھنے کے لیے مدینۃ النبیؐ سے کئی میل دور ایک الگ بستی بسائی گئی تاکہ پتھر کٹیں تو مدینہ کا ماحول متاثر نہ ہو۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کٹا اور تراشا ہوا پتھر مسجد نبوی پہنچا اور اس میں کسی ترمیم وتخفیف پڑی تو ٹھیک کرنے کے لیے اس بستی میں واپس لے جایا جاتا اور جب ماہرین نے کام شروع کیا تو انہیں حکم یہ تھا کہ ہر شخص کام کے دوران باوضو رہے اور مسلسل تلاوت قرآن کرتا رہے۔ تعمیر نو اور توسیع کا کام پندرہ سال جاری رہا۔ ایک حصے کو منہدم کرکے اسے بنالیتے تو اس کے بعد ہی دوسرے حصے کی تعمیر شروع کرتے تاکہ نماز باجماعت میں رکاوٹ نہ ہو۔ ریاض الجنۃ کی تعمیر کے دوران میں چھت اور زمین کے درمیان ستونوں کے اوپر لکڑی کے تختے لگادیئے تاکہ چھت منہدم ہوتے وقت اوپر سے مٹی نہ گرے۔ حجرہ مبارک کی جہاں امام الانبیاءؐ کی قبر مبارک ہے، اس کی جالیوں کے چاروں طرف کپڑا لپیٹ دیا گیا تاکہ گردوغبار اندر نہ جائے۔ (انگلش سیرت نبوی، مطبوعہ دارالسلام، ص:۱۶۲۔۱۶۳)

پہلی سعودی توسیع وتعمیر ۱۳۶۸ھ۔۱۹۵۱ء میں جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود کے حکم سے مسجد کے شمال مشرق اور مغرب میں اردگرد کے علاقے خرید کر مسجد میں شامل کردیئے گئے۔ عمارت مجیدیہ میں سے چھت دار جنوبی حصہ اسی طرح رہنے دیا گیا۔ اس طرح مسجد کی کل پیمائش ۱۶۳۲۶ مربع میٹر ہوگئی، یہ توسیع جس پر پانچ سو کروڑ ریال خرچ ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مکمل ہوئی۔

دوسری توسیع حکومت سعودی میں ۱۴۵۵ھ تا ۱۴۱۴ھ

خادم الحرمین الشریفین فہد بن عبدالعزیز کے عہد میں ہونے والی اس توسیع کے بعد نمازیوں کی گنجائش پہلے کے مقابلے میں نو گنا ہوگئی ہے۔ بیرونی دیواروں پر سنگ خارا لگایا گیا ہے، اس توسیع میں چھ نئے مینار بنائے گئے ہیں۔ نویں اور آخری توسیع سعودیوں کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ نچلی منزل پر ۳۱۵۴ ستونوں کا اضافہ کیا گیا ہے، نچلی منزل اور چھت پر دو لاکھ ۶۸/ہزار افراد نماز ادا کرسکتے ہیں، مسجد نبوی کے دروازوں کی مجموعی تعداد پچاسی ہے، چھت کے بڑے بڑے گنبدوں کی سجاوٹ پر ۶۸/کلوگرام سونا استعمال کیا گیا ہے، یہ گنبد مرکزی کمپیوٹر کے تحت ایک منٹ میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ صحن میں روشنی کے لیے ۱۵۱/فانوس نصب کیے گئے ہیں، زیر زمین کار پارکنگ میں ۴۵۰۰/گاڑیاں کھڑی کی جاسکتی ہیں، مسجد کے ایئر کنڈیشننگ کے نظام کو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاسکتا ہے، اس کا پلانٹ مسجد سے سات میل دور ہے تاکہ شور مسجد سے دور رہے۔ ٹھنڈا پانی اور ہوا ایک سرنگ کے ذریعہ مسجد میں پہنچتے ہیں۔ (مطبوعہ دارالسلام۔ انگلش سیرت نبوی، ص:۱۶۲۔۱۶۳)

حکیم سید شاہ محمد خیر الدین قادری، صوفی (نبیرہ شاہ چراغ دکن)، حیدرآباد

حضرت سید شاہ شجاع الدین علی حسنی حسینی قادری صوفیؒ

حضرت محترم حیدرآباد دکن کے سادات حسنی حسینی نجیب الطرفین بزرگ تھے، آپ کا اسم گرامی سید شجاع الدین علی صوفی کنیت ابوالحسنات، عرف مدنی بادشاہ اور تخلص بعض مرتبہ صوفی استعمال فرماتے تھے، حضرت محترم کے والد بزرگوار حضرت ابوالعابد اعظم علی صوفی اعظم حسینی قادری مجمع السلاسل المعروف بہ صوفی اعظم قطب دکن تھے اور آپ کے جدامجد ابوالاعظم سید سجاد علی صاحب صوفی معز درویش حسنی نہیں قادری مجمع السلاسل جونواب خورشید جاہ بہادر اور دیگر امرائے پائے گاہ کے اتالیق اور مرشد تھے۔ جن کا تذکرہ تاریخ خورشید جاہی میں موجود ہے۔ حضرت کی والدہ محترمہ حضرت کلثوم بیگم صاحب قطب الہند حضرت حافظ میر شجاع الدین حسین صاحب قبلہ (جن کا گنبد عیدی بازار میں ہے) کی نبیری زادی تھیں اور اس مناسبت سے آپ کا نام ''شجاع الدین'' رکھا گیا۔ حضرت صوفی اعظمؒ معہ اہل وعیال حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے لیے تشریف لے گئے اور وہیں قیام فرمایا۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران حضرت پیر عالم وجود میں آئے اور اسی سبب سے آپ کی عرفیت ''مدنی بادشاہ'' رکھی گئی اور اسی سے آپ زیادہ مشہور معروف ہیں حضرت کی ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ میں ہوئی۔ عصری علوم میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ حضرت کو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دیگر علوم میں اپنے والد بزرگوار حضرت صوفی اعظمؒ سے استفادہ کیا اور حضرت کے وصال کے بعد اپنے برادر معظم حضرت ابوالفیض سید سجاد علی صوفی صاحبؒ واعظ سرکارِ عالی کے زیر تربیت رہے۔ ابتدا ہی سے رشد وہدایت وعظ ونصیحت کا سلسلہ وراثتاً ملا تھا اور آخری وقت تک جاری رہا۔

بحیثیت جانشین حضرت صوفی اعظمؒ اپنے خلوت کدہ موسومہ ''تصوف کدہ'' کبوتر خانہ قدیم حسینی علم میں ۶۰ رسال سے زیادہ عرصہ تک مسند رشد وہدایت پر متمکن رہ کر مریدین ومعتقدین اور عامۃ المسلمین کی دینی، روحانی تربیت فرماتے رہے، روزانہ کثیر تعداد میں لوگ آپ سے ملاقات کے لیے اور آپ کی دعاؤں سے روحانی فیض وسکون حاصل کرتے تھے۔ نماز پنجگانہ کے علاوہ نماز تہجد، تلاوت قرآن اور ذکر واذکار میں پابندی سے مشغول رہتے تھے۔ وعظ ونصیحت کا سلسلہ ۶۰ رسال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ ''تصوف کدہ'' کبوتر خانہ میں مجالس وعظ کے علاوہ شہر حیدرآباد اور اضلاع تلنگانہ، آندھرا، کرناٹک، مہاراشٹرا، پونہ وبمبئی وغیرہ میں مسلسل آپ کے دورے ہوتے اور وعظ کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، اپنے وعظ وطریقت اور تصوف کے مسائل بڑے دلنشین انداز میں بیان فرماتے۔ اکثر مثنوی مولانا رومؒ کے اشعار اپنے مخصوص انداز وترنم میں برجستہ استعمال فرماتے۔ جس سے سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی۔ وعظ کے بعد بیعت کا سلسلہ جاری ہوتا اور کثیر تعداد میں لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ آپ کے مریدین ومعتقدین کی تعداد ہزاروں میں شہر حیدرآباد واضلاع تلنگانہ، مہاراشٹرا، احمد پور، مومن آباد، پارسی، اواٹھی پونہ، بمبئی وغیرہ کے علاوہ بیرونی ممالک میں موجود ہے۔ حضرت تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کے لیے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔ آپ ظہیرآباد، رنجھول، کوہیر، مومن آباد، احمد پور کیج وغیرہ کے دور دراز دیہاتوں میں تشریف لے جاتے۔ کئی مرتبہ آپ کو بس میں، گھوڑے پر، بنڈی میں اور پیدل سفر کرنا پڑتا۔ ان تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے خالصتاً للہ تبلیغ واشاعت دین کا کام انجام دیا۔ کئی دیہاتوں اور مواضعات میں مساجد اور مدارس قائم فرمائے، جو آج بھی موجود اور آباد ہیں۔

عزت نفس، خودداری، صبر واستقامت، صداقت ودیانت، طہارت وپاکیزگی آپ کی زندگی کے نمایاں اوصاف ہیں، طہارت اور پاکیزگی کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اپنے مریدین ومعتقدین کی ہمیشہ کتاب وسنت کی سختی سے پابندی کی تاکید فرماتے۔ آپ اکثر ادب کی تعلیم دیا کرتے اور فرماتے کہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھو اور جو چیز جس مقام کی نہیں ہے اس کو اس مقام پر رکھنا ظلم ہے۔

گر حفظِ مراتب نہ کُنی زِندیقی

ابو ہریرہ ایوبی 18 نیوز

ایشین گیمس 2018

انڈونیشیا کے جکارتہ میں ایشین گیمس 2018 کا شاندار انعقاد ہوا۔ ایشین گیمس میں ہندوستان کا مظاہرہ ہمیشہ بہترین رہتا ہے۔ اس بار بھی ہندوستانی کھلاڑیوں کا مظاہرہ ایشین گیمس میں شاندار رہا۔ 1951 کے بعد ہندوستانی وفد نے ایشین گیمس میں سب سے زیادہ میڈلس حاصل کئے۔ ہندوستان نے 15 گولڈ میڈلس کے ساتھ کل 69 تمغے اپنے نام کئے۔ یعنی جکارتہ میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ایشین گیمس میں بھی ہندوستانی مرد کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ ملک کی بیٹیوں بھی پیچھے نہیں رہیں۔ اتھلیٹکس میں سب سے زیادہ انیس میڈل ہندوستان کو ملے۔ جن میں سات گولڈ۔ دس سلور۔ اور دو کانسے کے تمغے شامل ہیں۔ اتھلیٹکس میں ہندوستان کا مظاہرہ پہلے سے بہتر ہوا ہے۔ کچھ کھیلوں میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے مایوس کیا۔ جن میں بیڈمنٹن اور ہاکی قابل ذکر ہیں۔ حالاں کہ ان کھیلوں میں بھی میڈلس ہندوستان کی جھولی میں آئے پر جتنے اچھے مظاہرے کی امید تھی۔ وہ ہندوستانی کھلاڑی نہیں کر پائے۔ کل ملا کر ہندوستان ایشین گیمس 2018 میں آٹھویں مقام پر رہا۔ ایشین گیمس میں ایک بار پھر چین کا دبدبہ رہا۔ چین نے سب سے زیادہ 289 میڈلس کے ساتھ سرفہرست رہا۔ چین کے بعد جاپان۔ جنوبی کوریا اور انڈونیشیا کا جلوہ رہا۔ حالاں کہ گوانگزو میں چین کی کارکردگی جکارتہ سے کہیں اچھی رہی تھی۔ خیر۔ چین کو ایشیائی ممالک میں کھیلوں کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر ہندوستان جیسا ملک جو کہ آبادی میں تو چین سے دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں بھی کھیلوں کو لیکر ایک جنون ہے۔ پھر نتائج اپنے پڑوسی جیسے کیوں نہیں آتے ہیں؟ یہ سو ٹکے کا سوال ہے۔ اور یہ سوال اسی وقت اٹھتے ہیں جب اولمپک یا ایشین گیمس ہوتے ہیں۔ جہاں ہمیشہ ہندوستانی کھلاڑی مایوس کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان۔ چین اور جاپان کی طرح اب کھیلوں پر پیسہ خرچ نہیں کرتا۔ لیکن ابھی بھی ہندوستان میں کھیلوں کا وہ ماحول نہیں ہے جو چین جاپان یا اور دوسرے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ براعظم افریقہ میں تو چھوٹے چھوٹے اور گمنام ممالک بھی کھیلوں کے معاملے میں ہندوستان سے کافی آگے ہیں۔ فٹبال سے لیکر جمناسٹک اور اتھلیٹکس میں ان ممالک کا دنیا پر جلوہ ہے۔ ہندوستان میں جہاں کھیلوں کا نہ تو ماحول ہے اور نا ہی سرکاریں اس جانب خاطر خواہ دھیان دیتی ہیں۔۔ اس کی تازہ مثال حالیہ ایشین گیمس میں دیکھنے کو ملی۔ دراصل دہلی کے رہنے والے ہریش نے ایشین گیمس 2018 میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور ملک کے لئے کانسے کا تمغہ جیتا۔ لیکن افسوس کہ اس ہیرو کو جکارتہ سے واپس آنے کے بعد پھر سے چائے بیچنی پڑ رہی ہے۔ ہریش ایشین گیمس میں کامیاب سفر کے بعد ایک بار پھر اپنی پرانی دوکان پر لوٹ آئے ہیں۔ ایسا ہے ہندوستان میں کھیل کا ماحول۔ اور میڈل جیتنے والے ہیرو کا حال۔ ایسے ماحول میں بھلا ہونہار کھلاڑی کیسے پیدا ہوں گے۔ جہاں ان ہیروز کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ ہریش اکلوتے کھلاڑی نہیں ہیں جن کی یہ داستان ہے۔ ہندوستان میں بہت سے کھلاڑیوں کا یہی حال ہے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بس ضرورت ہے اس کو صحیح رہنمائی اور اچھے ماحول کی۔ اور یہ اچھا ماحول جبھی تیار ہوگا جب ملک کی سرکاریں اس طرف ایمانداری سے دھیان دیں گی۔ ایسے میں کہا جا سکتا ہے کہ کھیلوں میں ہندوستان کا مستقبل روشن ہے۔ پر اس پر مزید دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

کتاب: مضراب نقد

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

مصنف: سراج احمد انصاری۔
صفحات: ۲۰۸۔
قیمت: ۳۵۰۔
ناشر: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی۔
مبصر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی۔

ڈاکٹر سراج احمد انصاری نوخیز قلم کار ہیں۔ ان کے عزائم و مقاصد میں صالح فکر مضمر ہے۔ ان کے دل میں ملک و ملت کی دردمندی ہر آن انہیں ٹھیس پہنچاتی رہتی ہے۔ ان کی زیر نظر تصنیف مضراب نقد جو کہ ان کی یہ پہلی کاوش ہے اس میں ان کے پندرہ مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشمولہ مضامین کی نوعیت تنقیدی ہے۔ ان مضامین کو انہوں نے مقررہ اور متعینہ قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں اور رسائل کے لیے لکھے تھے۔ اردو دنیا، قومی زبان، کتاب نما، چنتن سریجن اور فیضان ادب جیسے معیاری رسالوں میں شائع بھی ہوئے۔ جب انہیں احساس ہوا اور ان کے رفیقوں نے احساس دلایا کہ یہ مضامین کتابی شکل میں شائع ہونا چاہئے تو انہوں نے دل اور دوستوں کی آواز پر آمنا وصدقنا کہا۔ اس طرح یہ کتاب منظر عام پر خوب سے خوب تر ہو کر آ گئی۔ مشمولہ مضامین میں متنوع جہات ہیں ان کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔ ۱۔ تانیثی احتجاج اور اردو ناول، ۲۔ تعلیم مغربی مفکرین کی آرا کی روشنی میں ۳۔ نوآبادیاتی ادب اور پس نوآبادیاتی رجحان، ۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی نظریات، ۵۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں معاشرتی اقدار، ۶۔ رومانی تحریک اور اردو ادب، ۷۔ مظفر شہ میری کی ترائیلہ نگاری، ۸۔ اردو تحقیق اور دیگر مضامین کا منظر نامہ، ۹۔ بانو قدسیہ اور ان کا نثری ادب، ۱۰۔ ابن صفی عوام و خواص کی نظر میں: ایک جائزہ، ۱۱۔ بانو قدسیہ کی زبان و اسلوب، ۱۲۔ کسک عارض ایک تنقیدی مطالعہ، ۱۳۔ دل مُن کا تاریخی اور احتجاجی پس منظر، ۱۴۔ ناول گل بانو کا تنقیدی جائزہ، ۱۵۔ ناول قربان جاؤں کا تجزیاتی مطالعہ۔ یہ عنوانات فکشن، شاعری اور تحقیق و تنقید پر منحصر ہیں۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ کوئی نقاد اس کتاب پر مبسوط تجزیاتی مقالہ لکھے تاکہ اس کی وقعت و اہمیت کا

اندازہ ہو سکے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری اس کتاب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سراج احمد انصاری کی تحریر میں ان کی ادب فہمی کی کوشش صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ تنقید کی ابتدائی منزلیں طئے کر کے گہرائی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ فن تنقید کی گہرائی و گیرائی کو بہت جلد حاصل کر لیں گے۔

''(مضراب نقد،ص:۴)

مصنف کا انداز تحریر سلیس اور رواں ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیاں کم ہیں۔ مضامین میں علمی، معلوماتی اور سلیقگی صاف عیاں ہیں۔ امید قوی ہے کہ یہ تصنیف اردو ادبی حلقے میں پسند کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India